بسم الله الرحمن الرحيم

جل جلالہ

جو حرف حرف میں عکس جمال تیرا ہے
تو اس میں میرا ہے کیا، سب کمال تیرا ہے

خیالِ خاطرِ احباب

(تنقید۔تقریظ۔تبصرے)

ناصر علی سیّد

﴿جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں﴾

کتاب: خیالِ خاطرِ احباب
مصنف: ناصر علی سیّد
رابطہ: 0300-5821433
موضوع: تنقید۔تقریظ۔تبصرے
اہتمام: سیّد ذیشان ناصر 0345 9285418
تزئین ابتسام علی سیّد 364 655 7466 44+
پروف ریڈنگ: رفعت علی سیّد ۔ مبشر نور حکیم
سرورق: افراز علی سیّد afrazali@hotmail.com
تاریخ اشاعت: فروری 2025
مطبع Asia Printing & Packages
ناشر: ناصر علی سیّد
ISBN No 978-1-964720-12-8
قیمت: ایک ہزار روپے
امریکہ: 20 ڈالرز
برطانیہ: 15 پاؤنڈز
تعداد: پانچ سو
سنڈیکیٹ آف رائیٹرز، پاکستان (0345 9285418)
حلقۂ اربابِ ذوق، پسکاٹ وے (نیوجرسی۔امریکا)
رابطہ: ڈاکٹر عامر بیگ 0008-710 (201) 1+
aamermbaig@gmail.com

شاعر، ادیب، دانشور اور معالج

پروفیسر ڈاکٹر خالد مفتی کے نام

﴿جن سے دل و جاں کے کئی رشتے ہیں﴾

خیال خاطر احباب چاہیئے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو
(میر انیسؔ)

آبگینے

1. منفرد تحریروں کا خالق .... مشتاق شباب 1
2. مبداء فیاض کا گنجینہ معانی اور خیال خاطر احباب ...... نور حکیم جیلانی 4
3. رات مجلس میں تری .... نوید صادق 7
4. بیتی شاموں کا خسارہ .... ناصر علی سیّد 13
5. مکہ مدینہ کا راستہ کونسا ہے .... داستان سرائے اکوڑہ خٹک 15
6. درد مشترک .... کانچ کے گلدان 21
7. کہانی سے دوستی کا اسم اعظم .... روشندان میں اندھیرا 26
8. ۔۔۔اور شام تھی .... دستک 30
9. اگلی بار کے کہانی کار۔۔کتنا پانی .... اگلی بار 34
10. روایت اور جدت کے سنگم پر کھڑا جوگی .... حسن تغزل 41
11. اعصاب شکن رائیڈ .... ٹی ہاؤس 51
12. گھر، سفر، راستہ اور پورا سچ .... خوابِ دِگر 56
13. مسافروں کے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں .... ملائشیا 60
14. انبساط و ملال کی تصویریں .... محبت عام کرنا چاہتا ہوں 64
15. شہر، شام اور اچھوینی .... بیتے ہوئے کچھ ایسے دن ہیں 67
16. بس آخری قصہ سنا کے اٹھتا ہوں .... کشف 71
17. خالد! تو بہت درد ہے .... مون سون 76
18. وشمہ خان وشمہ کا نگار خانہ .... صاحب اور میں 86
19. دوستی کا ہاتھ بڑھاتی سفری دستاویز .... دیس پردیس 90
20. نیا شعری البم .... گونگی ہجرت 98
21. اب مسافر راستہ نہیں بھولتے .... اپنوں کے درمیان 102
22. دوریوں کا موسم .... درد کی دہلیز 108

23. ایک دل والی دلّی میں .... دل والی دلی میں 112
24. دیکھے ہوئے خوابوں کی تعبیر .... کہکشاں ہے میرے خوابوں کی....... 116
25. ماضی کی طرف کھلنے والے دریچے .... وادیٔ پشاور۔ گندھارا 118
26. زندگی میں لوگ کچھ ہوتے ہیں باد ساز گار .... رہنمائے سخن 123
27. مرحلۂ شوق .... حاشیۂ خیال 128
28. دشتِ امکان کے غبار میں گم .... پانچ قصیدے 131
29. پورے ادھورے خوابوں کی روشن تعبیریں .... کہکشاں ہے میرے خوابوں کی 134
30. لذتِ زندگی مبارک باد .... قرطبہ اُداس ہے 138
31. نوید ملک کی کامنی .... کامنی 142
32. کالم کہانی .... پانچواں موسم 144
33. جو کہوں گا سچ کہوں گا .... میں ایک فلاپ ہیرو ہوں 148
34. اُداسی کا نیلا رنگ .... اب ستارے میری تلاش میں ہیں 152
35. مرگ حال افسانہ اور پوری زندگی .... زندگی 162
36. رحمان باباؒ۔ ایک تعارف .... انتخاب کلام رحمان باباؒ 164
37. ایک روحانی تجربہ .... نور خزینہ 169
38. جنھیں نعت چنتی ہے .... تو کجا من کجا 173
39. ہسدے وسدے لوگ .... ہسدے وسدے لوگ 175
40. قطرے سے گہر ہونے تک .... ایوان غزل 180
41. ادبی کمٹ منٹ .... دفینہ خزینہ 182
42. قصّہ خوانی ایک البم .... قصہ خوانی 184
43. خوش آمدید .... بیماریوں کی حقیقت 187
44. نئی بستیاں .... غزالیات 190
45. نہ ستائش کی تمنا .... خیبر پختونخوا کا اردو ادب 192
46. ایک تازہ کار ڈرامہ نگار .... لاڈلی 194

47. ایک عمدہ کوشش .... اٹیک کار 196
48. شاعری اور موسیقی .... پپل وترے ﴿ہندکو﴾ 197
49. دوسرا پڑاؤ .... تعبیراں ﴿ہندکو﴾ 201
50. کرنوں کی تابانی .... دَ رنڑا پلوشے ﴿پشتو﴾ 205
51. ہر مضمون اے جدا میرا .... پھل پروتے ﴿ہندکو﴾ 208
50. ارشد جان کی غزل شاہکار ہے .... لا تراوسہ درتہ یادیم ﴿پشتو﴾ 212
53. دوسروں کو خود سے تو بہتر سمجھ .... دِل کنارے ﴿ہندکو﴾ 217
54. گزشتہ شب کے دیکھے ہوئے خواب .... مانتو 222
55. لکھنا اپنے عہد کی گواہی .... مجھے ہے حکم اذاں 228
56. ہم نے تو دل جلا کے سرِعام رکھ دیا .... حرف شیریں 232
57. بنیاد پرستی۔ایک آئینہ .... بنیاد پرستی کی حقیقت 234
58. ہر جا جہانِ دیگر است .... افکارِ تازہ 236
59. میں بحرِ زندگی کا اک تعجب خیز ساحل .... خیالات پریشاں 240
60. ایک پھول اور مہکا .... ہوا کی سرگوشی 243
61. اُجالا ہی اُجالا ہے .... محبت خدا ہے 244
62. ممنوعہ منطقوں میں جنم لینے والی .... گمان سے بیان تک 248
63. سنا ہے دے صدائیں تو بہاریں لوٹ .... خوشبو آواز دیتی ہے 250
64. شاہ غزالی کا چراغِ عشق .... شاہ غزالی 253
65. میں ہوں پنڈال تیری چاہت کا .... رشک حیات 255
66. ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں .... شباب کی باتیں 258
67. محبت کے موسموں کی کھٹی میٹھی کہانیاں .... ریت پر لکھی کہانیاں 262
68. دیکھو یہ میرے خواب تھے .... تقویم (افغان جنگ کے بیس سال).. 265
69. محبتیں .... ناصر علی سیّد 269

منفرد تحریروں کا خالق

ادب کی وہ کونسی صنف ہے جس میں ناصر نے ''دخل اندازی'' نہ کی ہو۔ شاعری، افسانہ نگاری، تنقید، تراجم، یہاں تک کہ کالم نگاری میں بھی خاص طور پر ادبی، ثقافتی اور سماجی سرگرمیوں پر مبنی کالم نگاری کرتے کرتے ''ادب کے اطراف میں'' کے نام سے اپنی علیحدہ پہچان کرائی۔ اور اس دوران اس نے پشاور کے ایک اہم اخبار روزنامہ آج کے ساتھ طویل وابستگی کے دوران اس کا مرتب کردہ ادبی صفحہ ''ادب سرائے'' ایک عرصہ سے دنیا بھر کے ادبی مراکز اور مختلف ممالک میں پھیلے ہوئے اہل قلم سے زبردست پذیرائی حاصل کر رہا ہے۔ جبکہ اندرون ملک اہم ترین ادبی جرائد اور رسائل میں اس کی تحریریں ادب دوستوں اور ادب نوازوں کو متاثر کر رہی ہیں۔ کئی ادبی تنظیموں کے وہ فعال رکن کی حیثیت سے نوجوان لکھاریوں کی ادبی تربیت میں اہم کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ اس نے کتابوں کے دیباچے، تقاریظ، تبصرے اور سرورق کے فلیپ لکھنے میں بھی ایک اہم مقام یوں حاصل کر لیا ہے کہ اگر محتاط اندازہ لگایا جائے تو شاید گزشتہ کچھ عرصے سے جتنی کتابوں پر اس نے اپنی رائے دی ہے تو دوسرے تبصرہ نگاروں کے مقابلے میں ان تحریروں کی تعداد شاید سب سے زیادہ ہے۔ یا پھر تعداد کے حوالے سے اس کے برابر چند ایک تبصرہ نگار ہی کھڑے نظر آئیں گے۔

جبکہ اس کے لکھے ہوئے دیباچے، تقاریز، تبصرے اپنی نوعیت میں خاص ہی ٹھہرتے ہیں۔ وہ انتہائی ''سونگھ کر'' ایک خاص فارمولے کے تحت مخصوص انداز سے نہیں لکھتے بلکہ وہ کتاب کے ساتھ سفر کرتے ہوئے لکھاری کی سوچ کو اپنے اوپر طاری کر کے پوری ادبی دیانتداری کے ساتھ قلم اٹھاتے ہیں۔ اس لئے ان کے تبصرے انفرادیت لئے ہوئے ہیں۔ اور جن کو کتاب پڑھنے سے پہلے کتاب کے بارے میں کچھ جاننے اور اس کتاب کے تخلیق کار کے حوالے سے کھوج لگانے میں دلچسپی رہتی ہے وہ اپنے رائے مرتب کرنے سے پہلے کتاب پر لکھے جانے والے تبصروں سے استفادہ کرتے ہیں، وہ ناصر کے لکھے ہوئے دیباچے، تقاریز اور فلیپ پڑھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

ناصر کیا لکھتا ہے؟ کیسے لکھتا ہے؟ اس کا اندازہ اس کے مخصوص ''سٹائل'' میں پوشیدہ دکھائی دیتا ہے۔ جیسا کہ تھامس ہارڈی نے کہا تھا کہ خالق اپنی تخلیق میں پوشیدہ رہ کر حسین دکھائی دیتا ہے۔ یوں اگر ناصر کے تبصرے پڑھتے ہوئے اس کا نام نہ بھی پڑھا جائے تو اس کے اندازِ تحریر (سٹائل) سے آشنا لوگ جان جاتے ہیں کہ اس منفرد تحریر کا خالق کون ہے اور وہ کتنی خوبصورتی کے ساتھ قاری کی انگلی پکڑ کر مضمون کی دنیا کی گلیوں میں گھوم رہا ہے۔ اس کے قلم میں ایک جادو ہے، ایک سحر ہے، اس سے ہر پڑھنے والا متاثر ہوئے بناء نہیں رہ سکتا، اور وہ لاکھ بھی چاہے تو اس سے جان نہیں چھڑا سکتا۔ الفاظ کے چناؤ، بیان کی تہذیب اس کی تحریروں کو بلند پروازی سے آشنا کرتے ہوئے فکر و فن کے کوہ ہمالیہ کی چوٹیوں پر روشن و درخشاں مقام عطا کرتی ہے۔

گزشتہ تقریباً ۶۰ سال سے بھی زیادہ ادب کی شاہراہوں پر ایک ساتھ سفر کرتے ہوئے جتنا میں ناصر علی سید کے فکر و فن سے واقف ہوا ہوں اور اگر میں کہوں کہ اس کے

مزاج کے موسموں سے جتنا باخبر میں ہوں، کوئی اور نہیں ہوسکتا، تو شاید غلط نہ ہوگا۔ وہ ادبی دیانت کے اونچے سنگھاسن پر براجمان ایک ایسے مقام پر نظر آتا ہے جہاں غیر جانبداری اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کا قاری اس کے ادبی کارناموں سے نہ صرف پوری طرح مطمئن ہے بلکہ اس کی بات کو موٗقر و مستعد گردان کر اس سے پوری طرح لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس کی تازہ تصنیف ادب میں اپنا وجود منواتے ہوئے کونسی نئی راہیں متعین کرنے کا باعث بنتی ہیں یہ آنے والا وقت بتائے گا۔ جبکہ مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کے سامنے آنے کے بعد کتابوں پر تبصرے کرنے والے اپنی راہوں کا از سرِ نو تعین کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

خاکسار

مشتاق شباب

مبداءِ فیاض کا گنجینہ معانی اور خیالِ خاطرِ احباب

دلی کے شوپن ہائر غالب نے کہا تھا کہ

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

عالم غیب جدید نفسیات میں لاشعور کو کہا جاتا ہے۔ جو فطرت وجدان لمس اور الہام الٰہی حواس خمسہ کے ذریعے اشیاء کو جذب و کرب سے گزارتا ہے جو بعد میں شعور میں آ کر شعر مضمون و خیال کا اظہار بن جاتا ہے۔

پروفیسر ناصر علی سید کو مبدأ فیاض نے وہ گنجینہ معانی اور طلسم خیال کا مرقع بنایا ہے کہ جو اپنی اعلیٰ فطرت، درست تربیت اور وسیع مطالعہ کی بناء پر مسلسل بلند پروازِ شعر و سخن کر رہا ہے۔ ظاہری سطح پر کبھی برصغیر کبھی ترکی ہندوستان، مصر و عرب تو کبھی ولایت پھر اور کبھی دوست بدنام امریکہ کا زمینی، ہوائی سفر تو کرتا ہی رہتا ہے لیکن اصل میں وہ مستقل مبدأ فیاض کے عطا کردہ، گنجینہ معانی و طلسم خیال کا سفیر ہے۔ وہ خود کہتے ہیں

یہ اور بات کہ موجود اپنے گھر میں ہوں
میں تیری سمت مگر مستقل سفر میں ہوں

ناصر علی سید نے خیالِ خاطرِ احباب میں وہ گنجینہ معانی اور طلسم خیال کے مضامین

احباب کی کتابوں پر تبصرے تحقیق اور تنقید کی شکل میں لکھے ہیں جیسے کہ یہ بھی مبدأ فیاض نے ان پر اُتارے ہیں جس جس کتاب پر تبصرے ہوتے ہیں ان میں ناصر نے تمثیلاتی، تخیلاتی منظر نامہ بنا کر ادبی پیرائے اظہار کے ذریعے احباب کی تحریروں کو سند اعتماد کے ساتھ ساتھ وفور و شوقِ پرواز بھی عطا کیا ہے۔ احباب کی کتابیں اگر قابل توجہ نہ بھی ہوں پھر بھی ناصر کے ذہنی فطرت وندرت کی مثبت جمالیاتی اختر ائیں ان کی کتابیں، قاری کو پڑھنے پر مجبور کرتی ہیں اور ناصر کی تبصرے اسے چار چاند لگا دیتے ہیں تکنیکی انداز میں اصلاحی پہلو کے ذریعے کسی ادیب اور دانشور کی کتاب پر تنقیدی تبصرہ کرنا اگر چہ ایک آسان کام ہے۔ مگر تبصرہ کرتے ہوئے کسی ادیب و دانشور کی ذہنی حد کو **Asthetic** پروانہ جمال دیکر بلندی سے ہم کنار کرنا پیر مغان، شان دبستان پشاور پروفیسر ناصر علی سید ہی کا کمال ہے وہ خود کہتا ہے

فلک پہ ہوں تو مجھے پہ طنزمت کر　　　زمیں تیرا ستارہ ڈھونڈتا ہوں

ویسے تو تمام مضامین خوب ہیں مگر اس مجموعہ خیال خاطر احباب میں ناصر کا رحمان بابا کے کلام کے انتخاب پر اور میری کتاب 'بنیاد پرستی پر ایک آئینہ' کے عنوان سے جو تبصرہ اور تقریظ لکھی ہے وہ پشتو اردو ادبی تاریخ، کا ارژنگ ارجمند پشتو ہے کہ جس کو پڑھ کے فارسی دان بھی انگشت بدندان رہ جائیں۔ ناصر وضع دار مگر بارعب مشرقی تہذیب کا رنگ ہے یہی اثر انکے کالم، ڈرامہ، ادب، شاعری، نظامت اور رویئے پر بھی ہے۔ اِسی کو خیال خاطر احباب کہتے ہیں۔ اسی ناصرانہ خوبیوں نے ناصر کو سب سے منفرد رکھا ہوا ہے۔ جو بھی اس سے ملتا ہے یہی کہتا ہے۔

خیال خاطر احباب میں اس کی مثال مضامین میں موجود ہے جیسے '' مکہ مدینہ کا سفر'' اور

اگلی بار کے کہانی کار ۔۔کتنا کتنا پانی، روایت اور جدت کے سنگم پر کھڑا جوگی ،اعصاب شکن رائیڈ، گھر، سفر، راستہ اور پورا سچ، مسافروں کے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں، انبساط وملال کی تصویریں، شہر، شام اور اچھوینی، بس آخری قصہ سنا کے اٹھتا ہوں وغیرہ میں دیکھے جا سکتے ہیں، ادبی مضامین ادیب شاعر ہی لکھتے ہیں اور بہت سے دانشور صحافی، ادبی دوست اور بھی ہوں گے مگر میری کتاب پر جو میں نے مغربی سامراج کے دوغلے پن پہ لکھی تھی کہ لوگ مغربی دوغلے پن کے مفہوم کو سمجھیں مگر یار لوگ نہ سمجھ سکے جبکہ اسی بات کو ناصر علی سید نے کیا خوب سمجھا بلکہ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے انکے دوغلے پن کی نمائش کی اس تبصرہ کا نام 'بنیاد پرستی۔ایک آئینہ' لکھا جس سے وہ مغرب کے دوغلے پن کے اسیر دانشور اور مشرق کے بےوقوف غیر دانش ور ادبا کا پول کھل جاتا ہے۔ بقول اقبال،

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا

ڈاکٹر نور حکیم جیلانی

رات مجلس میں تری......

لیجیے صاحب! کچھ باتیں، کچھ کھٹی میٹھی باتیں......کوئی قصہ گو ہے، کوئی تاریخ لکھے چلے جا رہا ہے، کہیں شعر چل رہے ہیں......کوئی آ رہا ہے......لیکن جو آ گیا وہ اس بزم سے اٹھ کر جانے کا نہیں......بات ہی کچھ ایسی ہے۔ بزم ہی ایسی ہے۔ کچھ دوست ہیں، کچھ بڑے، کچھ چھوٹے......چھوٹے کا لفظ میں محض عمر کے حوالے سے کہہ رہا ہوں ورنہ یہاں کوئی چھوٹا بڑا نہیں، سب......صاحبو عجیب ماجرا ہے، میں نہیں ہوں لیکن میں ہوں اور وہ یوں کہ اول اول تو میں کہیں نہیں تھا، پھر چوری چھپے بس یوں جانیے کہ میرا عالم اس بچے کا سا تھا جو طبعاً مرغوب شے کو بڑے ندیدے پن سے دیکھ رہا ہوتا ہے......ندیدہ...... کہتے ہیں یہ کوئی ادبی لفظ نہیں ......چلیے یوں کہہ لیتے ہیں کہ تا کا تا کی میں مصروف تھا......پھر کہیں کہیں خود کو محسوس کرنے لگا اور اب میں اس بزم میں جگہ جگہ موجود ہوں۔

میں ہوں......یعنی ان صفحات میں کہیں میں بھی ہوں، کہیں نہیں...... یہاں وہاں ہر طرف میں ہوں......ان مضمونوں...... پگلو! یہ مضمون تھوڑے ہیں، کہانیاں ہیں، کہانیاں بھی تو ادھوری ہیں، لیکن یہ ادھورا پن انہیں کہیں افسانے کے قریب لے جاتا ہے تو کہیں......کہیں کیا! کچھ کھلتا نہیں، غالب......آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں......

لیکن غیب و شہود کی باتیں......سچ بتاؤ' کیا تم ایسی باتوں پر یقین رکھتے ہو......مشکل سوال ہے' وہ ہمارے انور شعور تو کچھ اور کہہ رہے ہیں: فن کو سمجھ لیا گیا محض عطیۂ فلک......سعی و ریاض کا صلہ......شعور صاحب اب جانے بھی دیجیے' ناصؔر بھائی! یہ کیا باتیں کیے جا رہے ہیں آپ چپکے......کیا آپ نے کبھی مڑ کر دیکھنے کی زحمت فرمائی...... پیچھے سے آنے والی آوازیں بڑی خوف ناک ہوتی ہیں' آپ کو یاد ہے ایسی ہی آوازوں پر ایک جگہ جمال احسانی کی دائیں ایڑی گھوم ہی گئی تھی' وہ تو......میں نے تو آپ جیسے نوجوان بزرگوں سے یہ بھی سن رکھا ہے کہ پیچھے سے آنے والی آوازوں پر پیچھے مڑ کر دیکھنے سے انسان پتھر کا ہو جاتا ہے......ویسے جو بات میں اب کہنے جا رہا ہوں' کسی کو بتائیے گا نہیں کہ آپ کے پاس یادوں کے اتنے بڑے بڑے خزانے ہیں کہ آپ کہاں کہاں کس کس کو مڑ کر دیکھیں گے......ناصؔر بھائی! میرا مشورہ یاد رکھیے گا' ورنہ...... یہاں آپ کی ہمت کو داد تو دینا بنتا ہے کہ سب خطروں کے باوجود ہماری بھابھی سے نظریں بچا کر گاہے گاہے پیچھے دیکھ ہی لیتے ہیں' اور مزے کی بات ہے......مزے کی نہیں اعصاب کی مضبوطی کی بات ہے کہ اب تک پتھر کے نہیں ہوئے......اللہ اتنا حوصلہ اور ایسے اعصاب مجھے بھی دے!

میں......لیکن...... میں یہ کن باتوں میں الجھتا چلا جا رہا ہوں' اس سب سے مجھے کیا غرض' مجھے تو پڑھنے لکھنے سے کام ہے...... یہ کیا کہہ گیا ہے' لکھنا لکھانا میرے بس کا کہاں ہے' بس پڑھ لیتا ہوں سو پڑھے چلے جا رہا ہوں......دیکھتا ہوں لیکن ایک جگہ نظر ٹکے تو دیکھوں' لیجیے ایک اور صاحب یاد آ گئے' نام ہے ان کا شاد عظیم آبادی اور سرِ دست میری مشکل میں اضافہ کے لیے تشریف لائے لگتے ہیں۔ چلیے یوں ہے تو پھر

یوں ہی سہی:

دیکھتا تھا جس طرف اپنا ہی جلوہ تھا عیاں
میں نہ تھا ' وحشی کوئی اس آئینہ خانے میں تھا

سیّد صاحب! خدا آپ سے پوچھے' یہ آپ نے مجھے کس آئینہ خانہ میں لا کھڑا کیا ہے۔ خدا کی قسم! میں ان شرکائے مجلس میں سے کسی ایک کو بھی نہیں جانتا۔ بہت سوں کے تو نام تک اب سے پہلے نہیں سنے تھے' لیکن اب لگ رہا ہے کہ برسوں سے آشنا ہیں، چہرے مہرے سے دیکھے دیکھے محسوس ہو رہے ہیں۔ ان سے بات کرتے......ابھی تھوڑی دیر پہلے تک میں واقعی جھجھک رہا تھا' لیکن آپ نے تو گویا کوئی منتر پھونکا اور اہلِ محفل اور میں......واقعی آشنائی کی بہت سی منزلیں طے کر گئے۔ ایک آن میں......لیکن یہ آن بھلا کون سا پیمانہ ہوا' سائنس کا طالب علم ہوں لیکن یہاں آ کر بری طرح پھنس گیا ہوں کہ پہلے تو اس شے کا پتہ لگاؤں جسے میں ''آن'' کہہ رہا ہوں اور پھر اس آن کے بیسیوں ٹکڑے کر ڈالوں......لیکن مشکل یہ ہے کہ ان بیسیوں ٹکڑوں میں سے یہ پتہ کیسے چلاؤں کہ کس ٹکڑے میں آپ نے وہ سحر پھونکا......نہیں' سحر پھونکنے کی تو بات ہی میرے دائرہ احساس سے باہر ہے' یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ کس ٹکڑے میں آپ کا سحر اپنا کام کر گیا۔ قصہ مختصر! اب کوئی اجنبیت نہیں' سب اپنے اپنے لگ رہے ہیں' کہیں کسی حوالے سے کوئی تخصیص نہیں۔ تخصیص ہو بھی کیسے ؟ سید بادشاہ کے آستانہ پر ایسے سانحے رونما ہونے لگے گئے تو......پھر تو اللہ ہی حافظ ہے۔ خیر کوئی کہانی سنا رہا ہے' کہیں سفر کی روداد چل رہی ہے' کہیں شعر اپنا جادو جگا رہے ہیں۔ ٹھہرو!

''ہر کہانی کے سو پردے ہوتے ہیں اور وہ یہ جانتی ہے کہ اسے کس وقت کون سا پردہ اٹھانا ہے اور کس قدر اٹھانا ہے۔'' چلیے یوں ہی سہی:

''کچھ خواب ایسے ہوتے ہیں جنہیں بار دیگر نہیں دیکھا جا سکتا' ان کے ٹوٹنے کا قلق آخری سانس تک رہتا ہے' چہ جائیکہ وہ خواب آخری عمر کے عشق کی دین ہوں یا پھر یہ ان سیلانیوں کی اضطراری اور آفتابی طبیعت......''

چلیے صاحب نہیں دیکھتے' جو مزاجِ یار میں آئے۔ یوں بھی

''میں سدا کا سست، کاہل اور آج کا کام کل کی بجائے پرسوں بلکہ برسوں کی طرف اچھالنے والا''

دیکھ لیجیے: یہاں بھی ہاتھ کر گیا ہوں لیکن کسی اور کے ساتھ نہیں' اس بار بھی اپنے ہی ساتھ ہاتھ کر گیا ہوں۔ خدا معلوم اب اس کا کیا انجام ہوگا' انجام کوئی سا بھی ہو'' ہلکی پھلکی لیکن بصیرت افروز تنقیدی باتیں بھی ہو رہی ہیں:

''یہ اشعار سننے میں دیکھنے اور پڑھنے میں تو اچھے لگتے ہیں کیونکہ شعر کے سارے تقاضے پورے کرتے ہیں مگر ان میں سے بیشتر اشعار میں وہ تاثیر نہیں ہوتی جو دیر تک ساتھ دینے والے اشعار میں ہوتی ہے' کوئی کوئی شعر تو منطقی ربط سے بھی عاری ہوتا ہے۔''

اور پھر اشاروں کنایوں میں اِدھر اُدھر کے حوالہ جات اہلِ محفل کو کچھ بتانے' کچھ سمجھانے' کچھ سکھانے کے لیے بھی تو ساتھ ساتھ چل رہے ہیں:

''ایک بار یوسف رجا چشتی کے گھر ہونے والے مشاعرہ میں صدر محفل احمد فراز تھے' میں نے انہیں سٹیج پر آنے کی دعوت دی۔ وہ آئے اور مجھے کہا کہ میری ڈائری شاید

لان میں رہ گئی ہے۔ میں نے کسی سے منگوائی اور انہیں یہ کہہ کر دی کہ ''جناب یہ رہی آپ کی بیاض''۔ ہنستے ہوئے کہنے لگے کہ بیاض نہیں ورکشاپ! میں نے ان کی طرف استہفامیہ نظروں سے دیکھا تو انہوں نے اس ڈائری کے اوراق پلٹ کر مجھے دکھائے 'میں نے دیکھا کہ کئی غزلوں کے اشعار اور مصرعوں کو کاٹ کاٹ کر نئے مصرعے یا لفظ لکھے ہوئے تھے۔''

لیکن اس سارے البم میں ایسے کم فہم اور بے بصیرت بھی دکھائی پڑتے ہیں۔''ایسے شعراء بھی ہمارے آس پاس موجود رہتے ہیں جو میر تقی میر کی طرح برملا کہتے ہیں کہ

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

اور میر انیس کی طرح ان کا بھی دعویٰ یہی ہوتا ہے کہ ''اک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں''چلیے یہ بھی گوارا مگر کچھ تو اقبال ساجد کے ہم نوا بن جاتے ہیں جس نے ترنگ میں آ کر کہہ دیا تھا

ندیمؔ و فیضؔ و فراقؔ و فرازؔ کچھ بھی نہیں
نئے زمانے میں ان کا جواز کچھ بھی نہیں

لیکن کڑوی اور سچی بات کہ ساری بحث کا حاصل وصول معلوم پڑتی ہے:
''بڑا سچ یہی ہے کہ شعر کے لئے مسلسل ریاضت بھی درکار ہے اور نئے مضامین کے لئے راستے ہی نہیں دل و دماغ بھی کشادہ رکھنا پڑتے ہیں اور پھر شعر کہنے کے بعد بھی اس سے رومینس جاری رکھنا لازمی ہوتا ہے۔''

اور جب شاعران باتوں پر عمل پیرا رہتا ہے' شعر گوئی کو محض ایک جنگی مشق نہیں بنائے

رکھتا تو:

’’کہنے اور پڑھنے والا ایک دوسرے سے آنسو چھپانے کی بجائے ہاتھ میں ہاتھ دے کر محرومیوں اور نارسائیوں کے خلاف صف آرا ہو جاتا ہے۔‘‘

اور جو فہم و بصیرت رکھنے والے ہیں ان کے لیے ایسے واقعات میں سیکھنے کے لیے بہت کچھ ہے۔ دوستو! یہ بزم تو لگتا ہے۔۔لیکن آپ لوگوں کو کوئی اور کام نہیں ہے کیا؟ نہیں تو نہ سہی، پوری رات بیت گئی صبح قریب ہے، یوں بھی مرشد فرما گئے ہیں: 'ہائے کم بخت کو کس وقت خدا یاد آیا'۔ دور سے اذان کی آواز آنا شروع ہوگئی ہے۔ کتنی دل کشی ہے اس دور کی آواز میں......میں جانتا ہوں اب یہ آواز دھیرے دھیرے قریب آتی جائے گی، بہت قریب......اللہ اکبر اللہ اکبر......ہم کتنے خوش قسمت ہیں!

۔۔۔۔چلئے آپ لوگ مگن رہیے، میں تو چلا، مجھے صبح دفتر بھی جانا ہے اور پھر سارا دن......وہی معمول کے کام! ۔ میں گیا آپ بے شک مجھے پروفیسر زبیر سمجھ لیں۔۔۔۔’’پروفیسر زبیر انگریزی ادب کے استاد ہونے اور اچھا ذوق رکھنے کے باوجود ’’خالصتاً گھریلو قسم کے پروفیسر تھے‘ اور اکثر اچھی بھلی ادبی گفتگو ادھوری چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوتے پوچھو تو بتاتے ہیں ’’او یار بیگم نے جلد آنے کو کہا ہے بچوں نے یہ کہا وہ کہا گھر کچھ سودا سلف لے جانا ہے‘‘ قسم کی بات شروع کر دیتے اور مجھے یوں لگتا جیسے کھیر کھاتے کھاتے کسی نے منہ میں ریت کا چمچ ڈال دیا ہو۔‘‘

نوید صادق

مدیر کاروان، بیاض (لاہور)

بیتی شاموں کا خسارہ

اور اب پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو اونگھتی ہوئی کتنی ہی بے خواب راتوں کے جاگتے دریچوں کے ٹھنڈے شیشوں پر فریب دیتی ہوئی کٹھور شاموں کے کھلنڈرے لمحوں کی دستکوں کی سمفنی زندگی کے میلے میں بچھڑے ہوؤں کی یاد کے تاروں کو مرتعش کرتی رہی ہے اور پھر ایسی ہی کتنی راتیں، دھوپ میں جھلستے ہوئے دن اور انتظار کی سولی پر ٹنگی ہوئی شاموں کے خسارے سے میری نیندوں کا آنگن بھرتی رہی ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ کھوئی ہوئی ساعتوں کی تلاش ایک سعئ رایئگاں ہے مگر اسی سفر میں وہ اُن دیکھے جزیرے بھی تو دامن دل کھینچ لیتے ہیں جنہیں نامعلوم کے وقتوں سے کسی اجنبی کا انتظار رہتا ہے کیونکہ انھیں بھی علم ہے کہ یہ جہاں برباد لوگوں نے ہی آباد کیا ہوا ہے۔ بھٹکے ہوئے لوگوں نے، دھتکارے ہوئے لوگوں نے اسے رونق بخشی ہے کہ دلوں کی جنتوں سے نکالے ہوئے لوگ ہی ہمہ وقت دوسروں میں خوشیاں اور سرشاریاں بانٹتے ہیں۔ اس عمل میں خسارے کا دکھ آنکھوں میں مسلسل دھواں بھرتا رہتا ہے۔اس سے بچھڑنے والوں کی یادیں بھی ہمیشہ تروتازہ رہتی ہیں اور خود سے ایک لمبی بات کرنے کا سلیقہ بھی آجاتا ہے۔بس ایسے ہی کچھ خسارے میری یادوں کی گٹھڑی میں بندھے ہوئے ہیں، جانے انجانے میں کیا کچھ میں کھو بیٹھا ہوں میرے جیسے مبتلا شخص کو تو ہاتھوں سے

باندھی ہوئی اس گٹھڑی کو دانتوں سے کھولنے کا ہنر بھی نہیں آتا۔ جانو یہ ایک بے ترتیب سا گوشوارہ ہے جس میں گاؤں کی صبحوں، شہر کی شاموں، مجھے برباد کرنے والے خوابوں اور آباد رکھنے والے کچھ چہروں کا حساب کتاب ہے، جنہیں میں تو کھوجنے میں ناکام رہا ہوں لیکن اگر اس سفر کی کہانی پڑھتے ہوئے کسی موڑ پر بچھڑے ہوئے کسی بہت ہی اپنے کی یاد سے آپ کی آنکھوں میں کوئی منظر دھندلا جائے تو جان لیجئے کہ جس طرح گاؤں کی اُجلی صبحوں سے بے اختیار کئے جانے والوں نے شہر کی سانولی سلونی شاموں میں رونق کے رنگ بھر دیئے ہیں تو بالکل اسی طرح کے اُجڑے اور بے آسرا لوگوں نے ہی اس آباد دنیا کے باسیوں کو جینے کا ہنر اور سلیقہ سکھلایا ہے۔

شامیں فریب دیتی ہیں

شاعر: ناصر علی سیّد

مکہ مدینہ کا راستہ کونسا ہے

جو تین حیرانیاں میرے ساتھ ہی جواں ہو کر بڑھاپے کی دہلیز تک آ پہنچی ہیں ان میں سے ایک کا تعلق صرف ایک لنگوٹ کا تکلف کرنے والے آبنوسی رنگت والے بنگالی بابا سے ہے جو لال انگارہ آنکھوں کے ساتھ صرف ایک چھوٹا سا ڈول ہاتھ میں لئے اکوڑہ خٹک کے بازاروں میں گھومتا تھا وہ کسی سے کچھ نہیں مانگتا تھا۔ کسی نے کچھ دینا چاہا بھی تو ہاتھ جھٹک دیتا یا پھر کسی خوش نصیب سے چند سکے لے لیتا جو جا کر (غالباً) مختار حسین چائے والے کو دے دیتا۔ اس کی دکان اجمل خٹک اور میرے ننھیال کے گھروں کو جانے والے راستے کے نکڑ پر تھی میں نے (شاید کسی نے بھی) اسے بولتے نہیں سنا تھا مگر اکوڑہ کے باسی اسے احترام کی نظر سے دیکھتے اور اس کے بارے میں عجیب وغریب باتیں سننے کو ملتیں۔ مجھے یاد ہے کہ خانوں کے گڑھی کے قادر خان (جو بعد میں ٹرک ڈرائیور تھے) ہمارے سکول فیلو تھے۔ ایک شام اس نے ہم دوستوں کو قسم کھا کے بتایا کہ میں ایک رات گئے گاؤں واپس آ رہا تھا تو میں نے اسٹیشن پل کے نیچے بابا کو دیکھا۔ اس کا جسم سات ٹکڑوں میں بٹا ہوا تھا۔ میں سمجھا شاید کوئی حادثہ ہو گیا ہو گا اور ڈرائیور بھاگ گیا ہو گا۔ میں گھر آ گیا کہ صبح معلوم ہو گا۔ صبح آنکھ کھلتے ہی بازار کی طرف آیا کہ شاید کوئی بتائے تو میں حیران رہ گیا کہ بابا حسب معمول بازار میں گھوم

رہے تھے۔اس نے میری طرف لال انگارہ آنکھوں سے دیکھا، میں گھر کی طرف بھاگا اور پھر کتنے ہی دن مجھے بخار رہا۔اس کے بعد مجھے بنگالی بابا سے خوف آتا مگر وہ تو اپنی دھن میں یہاں وہاں گھومتا رہتا اور پھر اچانک غائب ہو گیا۔کسی نے اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔کیا بابا ایسا ہی تھا؟ جب بھی سوچتا ہوں قادر خان کے منہ زبانی سنا ہوا واقعہ مجھے حیرت کے سمندر میں ڈبو دیتا ہے۔پھر جب میں نے بیدلؔ حیدری کا یہ شعر سنا تو معلوم نہیں کتنی دیر تک اسے آنکھیں بند کر کے پڑھتا رہا اور پلکوں کے پیچھے بابا کا جسم ٹکڑوں میں بٹتا اور جڑتا نظر آتا رہا وہ حیرانی ابھی تک میری ہمزاد بنی ہوئی ہے۔

گرمی لگی تو خود کیسے الگ ہو کے سو گئے
سردی لگی تو خود کو دوبارہ پہن لیا

دوسری حیرانی کا تعلق اکوڑہ خٹک کے ''بادشاہی راستے'' کے پہلے موڑ پر واقع ایک بوڑھے درخت سے ہے۔ہماری ایک رشتہ دار خاتون پر غشی کے دورے پڑتے تھے۔بہت علاج کروایا مگر زیادہ فرق نہ آیا تو دم درود کا سلسلہ شروع ہو گیا پھر ایک عامل نے بتایا کہ یہ جنات کی کارستانی ہے، پورا قصہ تو معلوم نہیں کہ تب میں بہت چھوٹا تھا مگر کتنی ہی جمعراتیں، شام کے وقت میں اپنے کزن کے ساتھ اس درخت کے نیچے ذرا سا گڑھا کھود کر کھیر کی ایک رکابی رکھ کر آتا اور جمعہ کی صبح ہم جاتے اور گڑھا کھود کر جب رکابی نکالتے تو رکابی خالی ہوتی۔یہ سب کیا تھا؟ جتنا سوچتا ہوں الجھتا ہی جاتا ہوں۔

میری سمجھ میں نہ آنے والی تیسری حیرانی ٹڈی سے جڑی ہوئی ہے۔اکوڑہ خٹک کے تین وضع دار اور قابل احترام اساتذۂ کرام عصر کی نماز پڑھ کر اسی بادشاہی راستے سے

ہو کر ایک ٹیلے پر چڑھ کر کھیتوں میں شام کی سیر کرنے جاتے تھے۔(اب اس ٹیلے پر باغبانپورہ سکول ہے) کبھی کبھی میں بھی ان کے ساتھ ہو لیتا۔ یہ تین مہربان چہرے نور حسین استاد، بادام گل استاد اور میرے والد بزرگوار آغہ جی سیّد دلاور شاہ تھے۔ میرے ساتھ نور حسین استاد مرحوم کے برخوردار امداد حسین اور بادام گل استاد مرحوم کے برخوردار ہارون الرشید بھی ہوتے کہ یہ دونوں میرے کلاس فیلوز تھے۔ جب ہم کھیتوں کے قریب پہنچتے تو وہاں جھاڑیوں میں بہت سی ''ٹڈیاں'' ہوتیں، سبز رنگ اور گہرے زرد رنگ کی ٹڈی کی بڑی بڑی کانٹے دار ٹانگیں ہوتی ہیں۔ یہ وہی ٹڈیاں ہیں جو جھنڈ یا دَل کی صورت میں کسی کھیت پر ہلہ بول دیں تو دیکھتے ہی دیکھتے پورا کھیت چٹ کر جائیں، اکوڑہ خٹک میں اسے مکڑی کہا جاتا ہے۔ ہم انہیں انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے پکڑ کر جھاڑیوں سے زمین پر رکھتے اور بڑے مزے کی گدگدی ان دو انگلیوں میں ہوتی جو وہ خود کو چھڑانے کے لئے خاردار ٹانگوں پر زور کرتیں مگر پھر بےبس ہو جاتیں۔ ہم انہیں زمین پر رکھتے ہی پوچھتے کہ ''مکے مدینے کا راستہ کون سا ہے؟'' تو بےاختیار قبلے (مغرب) کی طرف رخ پھیر لیتیں اور پھر اڑ جاتیں۔ یہ حیرانی اور معمہ بھی آج تک میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ ٹڈی یا مکڑی ایسا کیوں کرتی ہے؟ وقت کو تو جیسے پر لگے ہوئے ہیں اُڑنے پر آئے تو براق کی سی تیزی سے اُڑنے لگتا ہے اور اگر اَڑنے پر آئے تو جیسے ایک پل صدیوں پر بھاری ہو جاتا ہے۔ بس اسی طرح اُڑتا اور اَڑتا ہوا وقت ہمارے ماتھے پر کئی کہانیاں لکھ کر آگے بڑھتا گیا وہ مہربان چہرے ایک ایک کر کے بجھتے چلے گئے جن سے میری طرح کم مایہ لوگ روشنی لیا کرتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے والد بزرگوار آغہ جی سید دلاور شاہ کے علم سے فیض یاب ہونے والے

سرِشام ہی حجرے میں اکٹھے ہو جاتے۔ مذہب، تاریخ، ادب اور معاشرتی آداب سے جڑی ہوئی حکایات واقعات اور روایات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا جو میں نے بہانے بہانے کبھی حجرے کے اندر جا کر اور کبھی کھڑکی کے نیچے بیٹھ کر سنا کیونکہ ہم بڑوں کی محفل میں بار نہیں پاتے تھے۔ البتہ والد صاحب کی غیر حاضری میں ان کے کمرے میں جا کر شعر و ادب کی کتابوں کو الٹنا پلٹنا میرا معمول تھا جن میں سعدی، حافظ شیرازی، اقبال، رحمان بابا اور ابوالکلام آزاد کی غبارِ خاطر سے اسی زمانے سے دوستی ہو گئی تھی۔ جب ان کتابوں کے ناموں کے ٹھیک سے ہجے کرنا بھی نہیں آتے تھے مگر فائدہ یہ ہوا کہ سکول پہنچ کر سکول کی لائبریری کا شاید ہی کوئی ناول، افسانوں کا مجموعہ یا شاعری کا مجموعہ ہوگا جو میرے نام سے ایشو نہ ہوا ہو۔ مگر یہ سب میری حیرانی کا حصہ کبھی نہیں بنے۔ حالانکہ میرے لبوں پر بھی ہمیشہ اس دعا کا پھول کھلا رہا کہ ''چھین کر علم کی نخوت مجھے حیرت دے دے'' حیرانی کے ساتھ بیتے ہوئے مگر بھیتر میں رکے ہوئے حوالے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ لیکن اس گنگا جمنا کے سنگم میں ایک ننھی سی سرسوتی ایک تازہ حیرانی کوئی سال بھر پہلے آن ملی۔ میں اکوڑہ خٹک میں ایک فوتگی کے سلسلے میں بہر فاتحہ بیٹھا ہوا تھا کہ برادرِ اصغر سید ناظم علی شاہ ایک دھان پان کے ایک چھوٹے سے بچے کو لے کر میری طرف آیا۔ دیکھنے میں وہ بمشکل میٹرک کا طالب علم لگتا تھا لیکن اس کے آنکھوں میں ایک غیر معمولی سی چمک نظر آئی۔ اس نے انتہائی مؤدب میں اپنا تعارف کراتے ہوئے جب یہ کہا کہ میں ایم فل کر چکا ہوں تو میں چونک اٹھا۔ بمشکل اپنی حیرانی پر قابو پاتے ہوئے اس سے Topic کا پوچھا۔ شاید یہ کنفرم کرنے کے لئے کہ برخوردار گپ تو نہیں لگا رہا۔ جب معلوم ہوا کہ اس نے

دارالعلوم حقانیہ کے ماہنامہ اردو مجلّہ ''الحق'' کے اردو ادب کی ترویج میں کردار پر کام کیا ہے اور پھر اتنی تفصیل سے الحق کے حوالے سے بات کی کہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس کا قد بڑھنے لگا۔ وہیں موجود میرے ایک کزن نے سوالیہ انداز میں اکوڑہ خٹک کی بظاہر ایک غیر معروف مرحوم شخصیت کے بارے میں پوچھا کہ ''انھیں جانتے ہیں'' تو اس برخوردار نے اس شخصیت پر اچھا خاصہ لیکچر دے ڈالا۔ مزید تعارف سے حیرت ہوئی کہ وہ حاجی جہانزیب کے نورِ چشم ہیں جو میرے پرانے محلے کا باسی ہے۔ میں نے اس سے اس کے چچا، اپنے مرحوم کلاس فیلو ہارون کا پوچھا، وہی ہارون جو بادام گل استاد کا بیٹا تھا اور میرے ساتھ شام کی سیر کو جایا کرتا تھا جب تین مہربان چہرے ہمارے ہمراہ ہوتے اور ہم ٹڈیوں کو پکڑتے تو ہماری انگلیوں پر گدگدی سی ہوتی، وہی مانوس سی گدگدی میں نے اپنے اعصاب میں محسوس کی خوشی ہوئی کہ میرے گاؤں، میرے محلے اور میرے مرحوم دوست کے خانوادے سے ایک برخوردار تنقید اور تحقیق کی بانبی میں ہاتھ ڈال رہا ہے اور اسے کوئی ڈر نہیں ہے کہ ''ہمت عالی کا عقاب ہمیشہ اپنے پروں کو دیکھتا ہے'' پھر میں نے ''ادب سرائے'' کے لئے اس سے آرٹیکل لیا اور اسے شائع کیا اچھی فیڈ بیک ملی، پھر ایک دن مجھے ملنے میرے گھر اکوڑہ خٹک آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک پلندہ تھا ''اکوڑہ خٹک تاریخ کے آئینے میں''۔ مجھے مسودہ دے کر کہا کہ اس پر چند سطریں لکھ دیں۔ میں مبتلا شخص کئی دن تک پڑھنے کا موقع نہ ملا۔ اُدھر اس کا اصرار اور اِدھر کاموں کا انبار۔ بالآخر جب اٹھایا پڑھنا شروع کیا تو پڑھتا ہی چلا گیا۔ بلا کی روانی اور زبان کا قدرتی بہاؤ ساتھ ہی بہانے لگا۔ کوئی کوئی خوبصورت لائن پڑھتے ہوئے اس دھان پان کے لڑکے کو آنکھوں کے سامنے لاتا تو گنگا جمنا کی

گہری حیرانیوں میں اس نئی حیران کرنے والی سرسوتی کے خدوخال واضح ہونے لگتے۔ الہ آباد میں تین دریاؤں کے جس سنگم پر 12 سال کے بعد کمبھ کا میلہ لگتا ہے وہاں گنگا اور جمنا کے دریاؤں کا ملنا تو نظر آتا ہے مگر تیسرے دریا سرسوتی کا وجود نظر نہیں آتا۔مگر تحقیق اور تنقید کی اس سرسوتی کا کام ہی اس کا تعارف ہے۔میری حیرانی کو اس وقت کا انتظار ہے جب آنے والے دنوں میں محمد عدنان زیب کو تشنگان ادب روک روک کر پوچھیں گے کہ ''مکے مدینے کا راستہ کون سا ہے''۔

داستاں سرائے اکوڑہ خٹک،

مصنف: عدنان زیب

دردِ مشترک

خالد۔۔۔۔۔۔ پتہ ہے جب دوایک محفلوں میں مجھے سعید نے تمہارے پہلے مجموعہ 'اک آرزو کا پھول' کے شائع ہونے کی نوید سناتے ہوئے کہا کہ ایک دو دنوں میں کتاب بھجوا دوں گا تو نئی کتاب دیکھنے کی جو ایک فطری خواہش میرے ساتھ ہی پلتی بڑھتی رہی ہے اس میں کچھ زیادہ ہلچل نہیں پیدا ہوئی اس لئے سعید کا روایتی لاابالی پن بھی مجھے زیادہ برا نہیں لگا اور جلد ہی میں نے سر کو جھٹک کر یہ بات بھلا دی۔ تمہاری نثر کی پہلی کتاب 'خوف کی پرچھائیاں' بھی میں نے نہ جانے کس کے گھر ایسے ہی دیکھی تھی اور اس کی ورق گردانی کے دوران ہی مجھے بہت سی باتیں اور اس کے مسودہ کو پڑھنا یاد آ گیا۔ تم سے ملے ہوئے ایک یگ بیت گیا تھا۔ پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی ہی نہیں اوپر سے بہت سا ٹریفک بھی گزر چکا تھا اور پل جب اتنا مصروف ہو جائے تو کناروں پر کھڑے دوست سماعتوں اور بصارتوں کی دسترس سے باہر ہو جاتے ہیں۔ پھر ایک دن بشریٰ فرخ نے تمھارا ذکر چھیڑ دیا اور شعری مجموعہ کی بات کی تو میں نے کہا کہ فاصلے بڑھ گئے ہیں، خالد، سعید کے ذریعے سال بھر پہلے اسے میرے لئے بھجوا چکا ہے۔ دیکھئے کب ملتا ہے۔'' اگر آپ کو چاہیے تو میرے پاس ہے ایک کاپی بھجوا دوں''۔ بشریٰ بھابھی نے کہا تو میں نے خود سے یہی سوال کیا، جواب آیا، کوئی حرج

نہیں۔ پتا ہے یہ کیا تھا اصل میں مجھے تمہارا مجموعہ نہیں۔۔تمہارا بھیجا ہوا مجموعہ چاہیے تھا۔تم سمجھ رہے ہونا۔خیر جب مجھے شعری مجموعہ 'اک آرزو کا پھول' ملا تو میں نے اسے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا۔اور میں آنکھیں بند کر کے تمھارے بارے میں سوچنے لگا۔تب میں کتنی ہی دیر تک تمہارے ساتھ اکوڑہ خٹک میں گھومتا رہا یہ دریا والی مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوں۔ یہ مرحوم امداد حسین لوگوں کے بنگلے کے برآمدے میں کیرم کھیل رہا ہوں۔اپنے حجرے کی کھڑکی سے دریا کی روانی دیکھ رہا ہوں۔منظر انکل کے گھر کے کمرے میں چابی والے گراموفون پر ریکارڈ چینج کرتے ہوئے بار بار لتا کا گانا 'تو نے ہائے میرے زخم جگر کو چھولیا' لگا لیتا ہوں۔ فتح محمد تنویر طاہر کڑھتے ہیں کہ یہی ایک گیت ہی کیوں بار بار؟ اور تم میرا ساتھ دیتے ہو کہ زبردست۔تمہاری تائید مجھے اعتماد دلاتی ہے۔تم لوگ کارڈز کھیلتے ہو۔ مجھے کھیلنا نہیں آتا۔گیم کے بعد اکثر میری فرمائش پر تم فیض کی غزل سناتے ہوئے مجھے ہمیشہ بہت اچھے لگتے ہو۔'گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے' پھر ایوب چن کے گھر کی دوسری منزل کی سیڑھیوں کے آخری سرے کے چبوترے پر کھڑے ہو کر تم شمع بینی کی بات کرتے ہو۔آئینہ بینی اور ٹیلی پیتھی پر بات کرتے ہوئے تم مجھے اکوڑہ کے بازاروں میں لال آنکھوں والے بنگالی بابا لگتے ہو۔ مجھے وہ انتظار بھی یاد آتا ہے جب میں گرمی کی چھٹیوں میں تم لوگوں کے آنے کا کیا کرتا تھا اور ایوب چن کے گھر کے دروازے کے سامنے والے بجلی کے کھمبے کا سہارا لے کر دیر تک کھڑا رہتا (چالیس سال کے بعد بھی عذرا بھابھی کو میرا وہاں کھڑا ہونا یاد ہے۔اس دن بتا رہی تھی نا؟) معلوم نہیں کتنے شب و روز ہم کن کن موضوعات پر باتیں کرتے تھے۔۔اور پھر وقت کو جیسے پر لگ گئے اور میں ایک دن

لیڈی ریڈنگ ہسپتال کے بولٹن بلاک کی دوسری منزل کے شمالی برآمدے کے جنگلے کے پاس تمہیں تسلی دے رہا تھا۔تم بے پناہ مغموم تھے۔ایوب چن ہسپتال میں تھے۔تمہاری حالت دیکھ کر میں نے کوئی فضول سا فلسفہ بگھارتے ہوئے تمہارے مرحوم ابا جان کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔مگر تم روتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ'وہ سانحہ تو میں جھیل گیا مگر مجھے نہیں لگتا کہ اگر چن کو کچھ ہوتا ہے تو میں یہ بھی جھیل پاؤں گا'۔تب میں نے اپنا کاندھا تمہارے بوجھل سر کے آگے کر دیا تھا اور پھر نہ جانے ہم کتنی دیر گم سم کھڑے رہے۔ خالد مگر اُس ماضی کی یاترا کا جو بھی حوالہ تھا'وہ اک آرزو کا پھول' میں نہیں تھا۔یا شاید تھا یا پھر یہ تمہارے نام کا اعجاز تھا کہ ماضی آنکھوں میں منجمد سا ہو گیا۔اصل میں دنیا داری اور گھر گرہستی کے چکروں نے پاؤں میں جو سفر باندھ دیئے تھے ان کے تقاضے کچھ اور تھے۔اب تیس برس کے بعد تم سے ملاقات ہوئی ہے تو ماضی کا رکا ہوا لمحہ جیسے پھر سے رواں ہو گیا اک آرزو کا پھول پر میں نے جو مضمون لکھا اس میں میرا احساس یہی تھا کہ خالد کو اپنے اندر کے موسموں سے ہم آہنگ لفظوں سے مکالمے کا ہنر آ گیا ہے اس لئے وہ روایتی کہانی کی چوتھی کھونٹ کا سفر سہولت کے ساتھ طے کرتے ہوئے واپسی پر چھلنی میں پانی لانے پر بھی قادر ہو گیا ہے۔اور واپسی کا یہ سفر ہوم کمنگ کا سفر ہے ہجرتوں کے مارے ہوئے خالد کے لئے دکھوں کی گٹھڑی سر پر اٹھائے اس سفر کی روداد کو لفظوں کی شکل میں پیش کرنا کتنا مشکل کام ہے یہ ان لفظوں کی شدتوں کو اپنے اندر اتارنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں ابھی میں ماضی کے اسی لمحے کی کھوج میں حیران و پریشان ہوں تم نے یار مجھے اپنے دوسرے مجموعے کا مسودہ تھما دیا ہے۔تیس سال بعد ملنے کی خوشی سیلی بریٹ کروں کہ ٹائم مشین میں بیٹھ کر چالیس سال پہلے کے خالد کا نفسیاتی تجزیہ

کروں۔ یا پھر ابن صفی کے کردار کرنل ہارڈ سٹون (فریدی) سے جذباتی وابستگی رکھنے والے خالد سے پوچھوں کہ دوسرے شعری مجموعے کا نام 'کانچ کے گلدان' کیوں رکھا گیا اس کے کرچی کرچی ہونے سے ڈر نہیں لگتا، مگر میں اسے بھی جرعہ جرعہ اپنے اندر انڈیل رہا ہوں۔ ماضی کا لمحہ جب اندر ڈیرے ڈال لیتا ہے تو وہ امر بیل کی طرح ہوتا ہے وہ مستقبل اور حال کو سانس لینے نہیں دیتا۔ تم نے یہ جو اس مجموعے میں نظمیں لکھی ہیں نا۔ یہ مجھے اندر سے کرچی کرچی کر رہی ہیں اور یادوں کے تہہ خانوں میں اترنے والے کم گوش تھوڑے ہوتے ہیں۔ تم نے ٹھیک کہا ہے۔

در جو کھولا ہے تو سسکی سی سنی ہے میں نے جیسے صدیوں سے دبائے ہوئے لاکھوں شکوے

ان کواڑوں نے مرے کان میں کہہ ڈالے ہوں آج اترا ہوں تری یاد کے تہہ خانے میں

یہ یادوں کا تہہ خانہ ذات کی پاتال میں ہی تو سجتا ہے۔ میں نے کوئی غلط کہا کہ تمہارے ہر نظم کے دریچے سے صدیوں پر محیط ایک طویل ہجر کا موسم ہی نظر آتا ہے جس سے جب بھی مکالمہ کا ڈول ڈالا جائے تو ایک بے نام سا خوف کنڈلی مار کر پھنکارنا شروع کر دیتا ہے اور پھر 'سانس لیتا ہوں تو دھڑکا سا لگا رہتا ہے' یا 'تجھ کو چھو لوں تو میرا ہاتھ نہ جل جائے کہیں' یا 'پھر میں اکیلا کھڑا ہوں افسردہ'، 'لائبریری میں تیری یادوں کی' پھر اس مکالمے میں کہیں کہیں خود کلامی بھی شامل ہو جاتی ہے 'ایک ٹھہرا ہوا لمحہ ہے کہاں ٹلتا ہے' اور بس یہی ٹھہرا ہوا لمحہ ہی وہ کلید ہے جس سے کانچ کے گلدان کا شعر پڑھنے والے پر کھلتا ہے۔ اُسے اپنا نام بتاتا ہے اپنا چہرہ کراتا ہے اور تب یہ کہنا آسان ہو جاتا ہے کہ تمہاری شاعری، کہانی ہے ماضی کے رکے ہوئے لمحے کی، خواب سے اپنی جڑوں کی تلاش کا، مستقبل کی کھڑکی سے ماضی کے موسموں سے مکالموں کا، اپنے کانوں میں

سرگوشی کالمس ہے۔کانچ کے گلدانوں میں باغ لگانے کی سعیٔ لاحاصل ہے۔سنو،سنو، ایک مزے کی بات سنو! آج میں اکوڑہ خٹک گیا تھا، روٹین کی شاہراہ سے نہیں۔ ماضی کی پگڈنڈی پر سے بھی نہیں لیکن پھر بھی جانے کیوں مالٹوں کے باغ والی سڑک پر مڑ گیا جہاں اب کوئی باغ نہیں ہے۔آ گے چل کے بہت ہی آباد قبرستان ہے اور پھر مسجد سفید اور مسجد سیاہ پہلو بہ پہلو مگر دونوں اب سفید ہیں۔قریب ہی دھرم شالا ہے مگر اب تو صدیوں سے وہاں گرلز سکول ہے۔ساتھ ہی دریا پوری جولانی پر ہے، کیا منظر ہے۔ میں رفعت اور دونوں بیٹوں افراز علی سیّد اور ابتسام علی سیّد کو ان دلچسپ راستوں اور رومانی گلیوں کی کہانی سنا رہا ہوں۔پھر گڑھی کی برسات (برساتی) آئی اور پھر وہی دریا والی مسجد، حجرہ بنگلہ، بار بار میں گاڑی روکنے کا کہتا اور کہانی سناتا رہا۔ بچے حیران تھے انہیں کیا خبر کہ تمہارے شعری مجموعے نے ایک بار پھر مجھے خود سے ملنے کا موقع فراہم کیا۔تمہارے شعر تو میرا حافظہ بنتے جا رہے ہیں اس لئے میں نے اس مجموعے کی شاعری کے خدوخال سے بات نہیں کی۔ان کی رگوں میں دوڑنے والے لہو سے خود کو گرمایا مہکایا اور تمہارے قرب کی خوشبو کو اتنی ہی شدت سے بسر کیا کہ جتنی شدت سے تم نے ماضی کے رُکے ہوئے لمحہ سے اپنا شعر کشید کیا ہے۔خالد پلیز مجھے معاف کرنا میں کانچ کے گلدانوں کے بجائے ان پھولوں کے رنگ و بو میں کھو گیا تھا جو ان گلدانوں تک شاید کبھی نہ پہنچ پائیں۔لیکن یہ بھی سچ ہے کہ میں اس کی نظموں اور کچھ غزلوں کے بارے میں اتنا تو کہہ سکتا ہوں کہ ’’تو نے، ہائے میرے زخمِ جگر کو چھولیا‘‘۔ خالد! کل کی طرح۔تم آج بھی میری تائید کرو گے۔کرو گے نا؟

کانچ کے گلدان

شاعر: خالد رؤف

کہانی سے دوستی کا اسم اعظم

یار یوسف تم نے کبھی تلخ قہوہ کے ساتھ میٹھی روٹی کھائی ہے؟ میں اس وقت یہی مزہ لے رہا ہوں میں نے قہوہ مانگا تھا اور تمہاری بھابھی ساتھ میٹھی روٹی بھی لے آئی ہے۔ اب تم سے بات کرنے کا لطف ماحول کو سہ آتشہ کر دے گا۔ تمہیں کچھ کچھ اندازہ تو ہوگا کہ تمہاری طرح مجھے بھی غیر روایتی راستوں سے کہانی کی اور سفر کرنا بہت ہانٹ کرتا ہے۔ مگر تم بسا اوقات کہانی کی اُسی ممنوعہ کھونٹ کا رخ بھی کر لیتے ہو جس پر چلتے ہوئے دو قدم دور ہی سے پتھر ہو جانے کے امکانات شروع ہو جاتے ہیں۔ مگر حرام ہے جو تمہیں ذرا بھی ڈر لگتا ہو شاید اس کی وجہ کہانی سے دوستی کا وہ اسم اعظم ہے جو تمہاری ریاضتِ نیم شبی نے تمہیں ودیعت کیا ہوا ہے۔ اس لئے جب اس کھونٹ کے سفر میں چند ماورائی تشنہ لب کرداروں سے تمہارا واسطہ پڑتا ہے تو ان کی خواہش کے مطابق ان کے لئے چھلنی میں پانی لانا تمہارے لئے محض ایک روٹین کی سرگرمی ہو جاتا ہے۔ کیونکہ چھلنی اور پانی جیسے پیراڈوکس ہی سے تمہاری کہانی کے کردار عبارت ہوتے ہیں۔ یہ جواب سماجی معنویت کی ایک نئی راگنی تمہاری نئی کہانیوں میں سنائی دے رہی ہے اس سے ایک طرف تمہارا قاری تمہارے قریب ہو گیا ہے دوسری طرف تمہاری کہانی کھلی فضا میں سانس لینے لگی ہے۔ تم نے کہا تھا کہ ''بڑی اور پراسرار سچائی تو کہانی

کا ہونا ہے''۔تو کہانی ہوتی تو ہے مگر اس کی پراسراریت انہیں اسے چھپائے رکھتی ہیں یہی وجہ ہے کہ تمہارے اندر سے بھی یہ آواز اٹھی ہے ''فرض کرو کہ وہ ایک کہانی تھی'' جب گڑیا کے جسم کے کانٹے ''ایک فرضی کہانی'' میں میرے اعصاب کو لہولہان کر رہے ہوں تو میں کیسے یقین کرلوں کہ یہ ایک فرضی کہانی ہے۔یا جب مجھے سرگوشی کے انداز میں خوابوں کی ''خبر'' دیتے ہوئے کہہ دو کہ باپ بیٹے کے بڑا آدمی بننے کے خوابوں سے ایک پل چھٹکارا نہیں پاسکتا تو کیوں دیر تک فلم کی صورت میرے ادھورے خواب میری آنکھوں میں رڑکتے سسکتے نظر آتے ہیں؟ یا باطنی کرب کو جب ''دھند'' کے پورے ادھورے جملے جگانے اور گدگدانے لگتے ہیں۔یا پھر ایڈگر ایلن پو کی طرح جب تم واقعاتی ڈرامے کی انگلی تھامے ''ایک تھی کہانی'' کے شہر میں داخل ہوتے ہو، تو میں اپنے سر پر آٹومیٹزم کا کھلا چھاتا بند کر کے اسمِ اعظم ڈھونڈنے لگتا ہوں۔میں تو تمہاری کہانی کے سنگ سنگ تمہارے پیچھے پیچھے گٹر میں بھی اتر جاتا ہوں۔جہاں تم نے کہانی کو تاثیریت کے قریب تر کر دیا ہے۔اور میرے سارے اندازے غلط ثابت کر دیئے ہیں کہ یوسف نا صرف خود تجریدیت کی گھپاؤں میں زیادہ سکون محسوس کرتا ہے بلکہ اپنے پڑھنے والوں کو بھی اس سکون کے ذائقے سے آشنا کرنا چاہتا ہے تمہیں یاد ہے کہ جب ہم نے ربع صدی قبل بیک زبان احباب سے کہہ دیا تھا کہ اس دور کو آسان کر دو کہانی مشکل نہیں لگے گی۔تب بھی یہی تقاضہ تھا کہ ''ایک تھا بادشاہ'' قسم کی کہانی علامتی بھی ہو تو چل جائے گی۔مگر کہانی کو افسانہ سے دیس نکالا نہ دیا جائے۔کیا بغیر کہانی کے بھی افسانہ ہوتا ہے۔مجھے بھی اتنی ہی مشکل پیش آتی ہے، جب میں بھی دوستوں کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں کہ بھائی کہانی تو افسانے کی ہر سطر میں موجود

ہوتی ہے اور یوسف تم تو پیراڈوکسز کے قالین پر اُڑتے پھرتے ہوئے اب کس کس کو سمجھاؤ گے کہ گرمی کی دوپہروں میں چھتوں پر جنم لینے والی کہانی جاڑے میں لحاف کے اندر سمٹ جاتی ہے۔ یہ آتش دان کے پاس بیٹھ کر کھائی جانے والی مونگ پھلی کے توڑنے کی آواز میں نہیں ہوتی۔ یہ مونگ پھلی کے اس دانے کی طرح ہوتی ہے جو بے خیالی میں ٹوٹ جاتا ہے اور اس ٹوٹے دانے کا ایک حصہ کہیں کھو جاتا ہے اور رہ رہ کر بے چین کرتا ہے۔ اسی کھوئے ہوئے ٹوٹے دانے ہی میں کہانی کا دوسرا سرا ہوتا ہے۔ بس یوں سمجھو کہ یہ ایک ''بھٹکے ہوئے خواب'' کا قصہ ہے۔ جو سرئیلزم کی نرم فضا میں سانس لے رہا ہے۔ ''مکروہ اور کریہہ دھاگے'' ان راستوں پر الجھانے لگتے ہیں جو منزل تک کبھی نہیں پہنچتے۔ منزلیں معدوم ہوں تو راستہ کھوٹا ہو ہی جاتا ہے۔ تم نے ''لہولہان'' کہانی کو بھی آگے چلنے پر مجبور کر دیا ہے کہ ''کہانی کا سفر رکتا نہیں''۔ اور سرئیلزم کی کھونٹی سے لٹکی ''شب برات'' کے بلیغ تر اشارے بھی ہاتھ بڑھا کر دوسری کی دعوت دیتے ہیں۔ یوسف میں اس کرب کو محسوس کر رہا ہوں جو تم نے ''نفی اثبات'' کہانی کو بنتے ہوئے حرف حرف سہا ہوگا۔ یہ نفی اثبات کا راستہ بلا کا دشوار گزار راستہ ہے اندر، ذات کے اندر اترنے والی سیڑھیاں بس ایسی ہی ہوتی ہیں۔ جس پائیدان پر پاؤں ہوتے ہیں صرف وہی دِکھتا ہے۔ مڑ کر دیکھو تو جن سیڑھیوں سے اترے ہیں وہ غائب ہو جاتی ہیں۔ یہ سفر ہلکان کر دینے والا سفر ہے۔ مگر تمہاری تخلیقی چٹک نے اسے ایک معنویت دے دی ہے جس نے میرے وجود کو بھی ایک ڈھارس سی بخش دی ہے۔ دیکھو یہ جو کہانی تم سے بار بار اپنے ہونے کی سند مانگتی ہے یہ تمہیں چھیڑتی ہے میرے دوست اس کو بس اس کے حال پر چھوڑ دو یہ خود بخود اجتماعی شعور میں رچ بس جائے

گی۔ میں جانتا ہوں کہ تم جس بھی موضوع سے دوستی کر کے اسے کاغذ پر اتارتے ہو یہ سامنے کھڑے ہو جاتی ہے۔ مانو یہ شادی کی تقریب میں شامل وہ بچہ ہے جو ہر تصویر میں زبردستی شامل ہو جاتا ہے۔ یاد رکھو افسانے کا سفر غیر مرتب تصویروں میں ہی ہموار رہتا ہے مگر دخل در معقولات کا باعث بننے والی کہانی اس میں کھنڈت ڈالتی ہے۔ اس کو باندھ کر رکھو گے تو سفر خوشگوار ہو جائے گا۔ ایک بات اور بتاؤں کہ غیر مرئی طاقت کا مظہر، ماورائی کرداروں کے اطراف، جو افسانہ سانس لیتا ہے وہی افسانہ کہیں اندر سے چھو جاتا ہے اور چپ کرا دیتا ہے۔ روشن دان میں تازہ ہوا اور روشنی کا گزر ہوتا ہے یہ واقعہ ہے۔۔ اور جب روشندان میں اندھیرا در آتا ہے تو یہ المیہ، پڑھنے والوں کے اندر سوالات کے جتنے دریچے کھولتا ہے، اتنے ہی کہانی کے معتبر ہونے کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں، مسئلہ چھلنی اور پانی کا ہو، روشندان اور اندھیرے کا ہو، چیخ اور سناٹے کا ہو یا تلخ قہوے کے ساتھ میٹھی روٹی کا مجھے تو تمہاری اس محفل میں ان سب کی موجودگی نے بہت سرشار کر دیا ہے۔ یوسف اجازت ہو تو میں ایک بار پھر "نفی اثبات" کے شہر میں داخل ہو جاؤں کیونکہ میں ابھی کچھ دیر اور اس کیفیت سے نکلنا نہیں چاہتا۔ رفعت یار! ایک کپ قہوہ اور ایک ٹکڑا میٹھی روٹی کا اور مل جائے گا۔۔۔ پلیز۔،

روشندان میں اندھیرا

کہانی کار: یوسف عزیز زاہد

اور شام تھی

میں نے اسلم فیضی کے شعر کے ساتھ بہت وقت گزارا ہے اس لئے جب انہوں نے حکم صادر کیا کہ شعر کو پڑھنا ہی نہیں پرکھنا بھی ہے اور پھر لکھنا بھی ہے تو میں نے بڑی سہولت سے کہہ دیا کیوں نہیں جناب آپ کہیں اور ہم نہ لکھیں کیسے ممکن ہے مگر اب جو اسلم فیضی کے شعری نگار خانے میں داخل ہوا تو ہر پیکر شعر نے سرگوشیاں شروع کر دیں، یہیں رک جاؤ جی، ایسا ایسا کرشمہ قدم قدم پر جلوہ دکھانے لگا کہ مجھے چپ کرا دیا۔ اب اُدھر ان کا تقاضہ کہ چند سطریں لکھ بھیجئے اِدھر میں شعر کے سحر میں گرفتار، کیا لکھنا، کیا بھیجنا، اب دیکھئے نا یہ شعر:

پنچھیوں کی ڈاریں ہیں سرمئی پہاڑی ہے
جھیل کا کنارہ ہے شام ہونے والی ہے

کون بدذوق ہوگا جو اس شعر کی کیفیت کی بکل مار کر آنے والی شام کے قدموں کی آہٹ سننے کی بجائے کاغذ کالا کرنا شروع کرے گا۔ یوں بھی اسلم فیضی نے شعر کہاں لکھے ہیں تصویریں بنائی ہیں۔ اور یہ تصویریں فطرت کی مہربانیوں کی ہیں۔ موسموں کی چاہتوں کی ہیں۔ گداز لمحوں کی کہانیاں ہیں۔ نرم ساعتوں کے قصے ہیں ان تصویروں پر سٹروکس بارش کی کن من کن من بوندوں نے لگائے ہیں اور خوشبو کے سندیسوں نے

انہیں چہرہ دیا ہے۔ گہری ہوتی ہوئی شام تو جیسے ان کے شعری معبد کی دہلیز پر کھڑی مسلسل گھنٹیاں بجا رہی ہے۔ اب یہ تصویر دیکھئے:

ایک تنہا کونج کرلاتی ہوئی
بہتی ندیا پاس ہے اور شام ہے

بس شعر پڑھتے جایئے اور تصویریں خود بخود بنتی جائیں گی۔

چاند بھی آ کر رک سا گیا ہے
کس نے اپنی کھڑکی کھولی

اور ان تصویروں کی محفل چھوڑ کر لکھنے کا مجھے ذرا بھی خیال آتا تو چیت کی بارش میری فائبر گلاس کی چھت پر میلے لگانے لگتی اور میں پھر اسلم فیضی کے شعر کے نگار خانے کی طرف رجوع کر لیتا۔

کھلا ہے گھر کا دروازہ ابھی تک
کوئی بارش میں دستک دے گیا تھا
سرشاری کا موسم بھی کیا موسم تھا
میں اور بارش مل کر گایا کرتے تھے

اب کہانی کچھ کچھ دوستی پر آمادہ ہو رہی تھی۔ ''سرشاری کا موسم بھی کیا موسم تھا'' یہ کون موسم ہے جو انگلی چھڑا بیٹھا ہے اور اب شعر سپردِ شام ہونے لگے۔ بار بار شام کا ذکر، بارش کی بات بہانے بہانے شعر میں در آتی ہے۔ یہ خیال کیا آیا کہ اب نظریں تو اشعار پر تھیں مگر پڑھ میں کچھ اور رہا تھا۔ سوچ رہا تھا کس دورِ ابتلا میں زندگی کا قافلہ آن پہنچا۔ کیسے اپنے اندر سمٹ کر یار لوگ بیٹھ گئے ہیں۔ دن کے ہنگامے آلودگی کی نذر ہو گئے۔

بیگانگی کا سانپ ہر آنگن میں پھنکارنے لگا۔ یہ ابتر شام وسحر قیامت سے الگ نہیں مگر یہاں نفسانفسی کی چیخ وپکار نہیں، لوگ اپنے اپنے پسینے میں شرابور ہیں یا پھر کسی سے اپنا دکھ شیئر نہیں کرتے۔ آوازوں کو دھیما رکھتے ہیں، چپ چاپ اپنی آگ میں سلگ رہے ہیں۔ گویا نفسانفسی بلا کی ہے مگر چیخ و پکار نہیں لوگ سہم گئے ہیں۔ بس بیگانگی کا، لاتعلقی کا ایک احساس ہے جو فربہ ہوتا جا رہا ہے۔ عجیب خالی خالی سے دن گزر رہے ہیں۔ کسی کو دن کے ہنگاموں میں یاد ہی نہیں رہتا کہ اگلا موڑ شام کا بھی تو آنا ہے جب وہ اکیلا رہ جائے گا مگر اکیلا تو وہ اب بھی ہے۔ ایک ہی کھونٹے سے بندھا دائرہ دائرہ گھوم رہا ہے اور اس اداس شام کا انتظار کر رہا ہے جب زندگی اس سے انگلی چھڑا لے گی۔ بس یہی بات، اسلم فیضی کی انسان دوستی اور اپنے لوگوں سے بے پناہ محبت کے تاج محل میں پیلاہٹیں بھر رہی ہے۔ سدا کا شائستہ اور مہذب اسلم فیضی اپنی تہذیبی روایات کا امین، کہیں بھی لاؤڈ نہیں ہوتا وہ تو نرم وگداز لہجے میں یاد دلاتا ہے کہ کبھی یہاں، انہی گلیوں میں، دوسروں پر اپنی خوشیاں نچھاور کرنے کا چلن عام تھا تب بیگانگی اور لاتعلقی کا عفریت یہاں ان محبت کرنے والوں کے قریب آنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس لئے اس کی کسی شعری تصویر میں شوخ رنگ استعمال ہی نہیں ہوا۔ وہ اچھے موسموں کی بات کرتا ہے تو وہ چیزوں کو اچھا دیکھنا ہی نہیں دکھانا بھی چاہتا ہے۔ وہ بارش کی بوندوں اور پانی کا ذکر کرتا ہے تو وہ ماحول کی آلودگی کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ وہ ندی، تالاب اور جھیل کی تصویر بناتا ہے تو وہ پاکیزہ اور شفاف روّیوں کی عکاسی کرتا ہے۔ وہ آج کے ناگفتہ بہ حالات کو بھلا کر سرشاری کے زمانے یاد کرتا ہے۔ اس کی خواہش اور تمنا ہے کہ وہ اپنے 'آج' کو گزشتہ کل کے پرامن اور محبت بھرے رنگوں سے

خوبصورت بنائے۔اور یہ جو آج ہم مجلسی زندگی سے دور ہو کر اپنے گھروں اور لاؤنج سے ہوتے ہوئے اپنے کمرے کے ایک کونے میں لاتعلقی کی بکل مار کر خوش خوش بیٹھے ہیں، اسلم فیضی اس حالت سے باہر نکالنے کے لئے کوئی بوجھل مشورہ، نصیحت یا فلسفیانہ موشگافیوں کا سہارا لینے کی بجائے بہت ہی شیریں اور مدھر لہجے میں یادوں اور اچھے دنوں کی یادوں کی ایک ٹپہ کھاتی ہوئی گیند کمرے میں پھینک دیتا ہے، اور اس امید پر کہ گیند کا یہ دھمال آپ کا رشتہ اچھے موسموں سے جوڑ کر آپ کو احباب کی صحبت میں گزاری ہوئی ان گنت سانولی سلونی شاموں کے رنگوں میں شرابور کر دے گا۔ لیجیے میں آپ کی مدد کرتا ہوں:

یاد ہیں چوپال کی رنگینیاں
حلقہء احباب تھا اور شام تھی
کیوں نہ پھر فیضی قدم رکتے وہاں
کونج تھی، تالاب تھا اور شام تھی

دستک
شاعر: اسلم فیضی

اگلی بار کے کہانی کار۔۔۔کتنا کتنا پانی۔

کہیں لڑکپن میں آنہ لائبریری کے مقبول ناول نگار دت بھارتی کا ناول ''گناہ'' پڑھا تھا اس کا ایک کردار آج تک میرا پیچھا نہیں چھوڑتا، یہ کردار بھارت کے جنگلوں میں رہنے والا ایک سادھو ہے جو اس علاقے کے فارسٹ آفیسر کے بنگلے میں الاؤ روشن دیکھ کر آتا ہے اور اجازت لے کر اپنے تھیلے سے ایک کٹورا نکال کر اس میں مٹھی بھر چاول اور پانی ڈال کر آگ پر رکھتا ہے اور ابلنے پر آگ سے ہٹا کر جانا چاہتا ہے تو نوجوان آفیسر اسے وہیں بیٹھ کر کھانے کو کہتا ہے اور حیران ہو کر سوچتا ہے کہ بھلا نمک گھی کے بغیر کوئی بھی کیسے چاول کھا سکتا ہے۔ حیرت اسے یہ بھی تھی کہ سادھو کا لہجہ گفتگو اور رکھ رکھاؤ پڑھے لکھے لوگوں کی طرح تھا، پھر سوچا کہ شاید کبھی سکول بھی گیا ہو مگر دو تین جماعتیں پڑھ کر گھر سے بھاگ کر اب جنگل جنگل گھوم رہا ہے۔ وقت گزاری کے لئے آفیسر اس سے بات چیت کرتا ہے، تب سادھو اُس کو ایک کہانی سناتا ہے اس ناول کو کئی بار پڑھنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ کہانی بننا اور پھر اسے سلیقے سے سنانا ایک الگ آرٹ ہے اور بلا کا مشکل آرٹ، اس ناول کا وہ سادھو بس اسی زمانے سے میرے ساتھ ہی رہتا ہے اور روپ بدل بدل کر مجھے کہانیاں سناتا رہتا ہے سادھو سے کہانی سننا میری مجبوری ہے چاہتا ہوں کہ اس طرح مجھے بھی کہانی سننے اور پڑھنے کی

اٹکل آ جائے، جو میرے نزدیک کہانی بننے اور سنانے سے کسی طرح بھی کم نہیں، ویسے بھی میں اب کوئی کہانی یا افسانہ پڑھتا نہیں ہوں اس سے رومینس شروع کر دیتا ہوں، سادھو جانے کہاں کہاں سے میرے لئے داستانیں، کہانیاں اور افسانے اکٹھے کرتا رہتا ہے۔ میری میز بھرتی جاتی ہے، اور اس کی کوشش ہوتی ہے کہ میں ان سارے قصے کہانیوں کے سنگ زیادہ وقت بتاؤں۔ مگر وہ کم کم ہی کامیاب ہوتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ میں اب رومینس کے معاملے میں بڑی حد تک محتاط ہو گیا ہوں، میں فلرٹ تو نہیں ہوں مگر یہ بھی سچ ہے کہ افسانوں سے میرا یہ رومینس فقط چندروزہ ہی ہوتا ہے۔ اور اسی بات کا قلق سادھو کو ہمیشہ رہتا ہے کہ میں زیادہ وقت کہانی کو نہیں دیتا۔ البتہ اب کے کچھ ہفتے شاید کچھ مہینے پہلے میرا ایک رومینس شروع ہوا اور ابھی جاری ہے لگتا ہے اب اس پر کوئی اور رنگ چڑھنے والا نہیں، یہ آخری عمر کے عشق بس ایسے ہی ہوتے ہیں، اب سادھو مجھے حیرت سے دیکھتا رہتا ہے کہ میں کیسے ایک ہی کھونٹے سے بندھ گیا ہوں مجھے کہتا ہے کہ اگلی بار ایسا کچھ نہیں لا کر دوں گا کہ تم مجھ سے بھی لاتعلق ہو جاؤ۔ میں کہتا ہوں کہ سادھو یہ ''اگلی بار'' تو تم مجھے دے چکے ہو، چلو بیٹھو میرے پاس آج تمہیں میں بتاتا ہوں کہ کہانی کیا ہوتی ہے۔ افسانہ کیا ہوتا ہے۔ میں نے ٹھہر ٹھہر کر کہنا شروع کیا سنو! ''افسانہ پت جھڑ کا آخری پتہ اور بہار کی پہلی کونپل ہے'' افسانہ۔۔ یکلخت میری بات کاٹتے ہوئے سادھو نے کہا مگر یہ بات تو میں نے ہی تمہیں بتائی تھی۔۔ تم نے؟ تم نے بتائی تھی، کب؟؟ یاد کرو وہ رات جب بارش کی بوندیں فائبر گلاس کی چھت پر جلترنگ بجا رہی تھیں اور ہم دونوں کملا جھریا کو سن رہے تھے، کملا جھریا کی کرلاتی آواز ہمیں اپنی بانہوں میں بھر کر قطرہ قطرہ پگھل رہی تھی۔ ''نہ

تم میرے، نہ دل میرا نہ جان ناتواں میری' تب اچانک میں نے اسی کیفیت کو دوآتشہ کرنے کے لئے تمہیں کچھ نئی کہانیاں سنانے کا فیصلہ کیا تھا، مجھے یاد ہے کہ کہانی سنانے سے پہلے تمہیں اس نئے رومینس کے لئے تیار کرتے ہوئے میں نے کہانی اور افسانے کے خدوخال کا نقشہ کھینچتے ہوئے یہ بات کہی تھی اور مجھے اچھی طرح یاد ہے صرف یہ نہیں، میں نے یہ بھی کہا تھا کہ ''افسانہ بلی ماراں کے غربت کدے میں شب غم کا جشن منانے والی عظمت ہے'' جسے سن کر تم نے شیلف میں پڑے دیوانِ غالب پر نظریں ٹکا دیں تھیں۔ سادھو کہہ رہا تھا کہ میرے لئے یہ وقت ہمیشہ صبر طلب عاشقی اور بے تاب تمنا کی تصویر بن جاتا ہے، سادھو مجھے بتا رہا تھا کہ جب تمہاری نظریں دیوان غالب پر ٹک جاتی ہیں تو غالب تم پر پھر غالب آ جاتا ہے اور تم کسی اور کے کیا اپنے بھی نہیں رہتے، میں ہر بار کوشش کرتا ہوں اور پھر ناکام ہو کر چپ سادھ لیتا ہوں، مگر پھر جب میں نے اچانک کہا۔ کہ ''افسانہ کلکتے کی ایک ڈومنی کی انانیت ہے'' تو مجھے بڑی حیرانی ہوئی کہ تم نے دیوان غالب سے نظریں ہٹا کر مجھے دیکھا اور پوچھا۔ سادھو تم نے بھی تو کسی کی انانیت کے ساتھ کھلواڑ کیا تھا نا۔؟ میں اس سوال کے لئے قطعاً تیار نہیں تھا، میں چپ ہو گیا اور پھر دھیرے سے نظریں جھکا کر کہا کہ اسی ''گناہ'' کی سزا تو جنگلوں میں بھٹکتے ہوئے بھگت رہا ہوں، سزا جو میرے ضمیر کی عدالت نے سنائی ہے، میں نے جب الاؤ تاپتے انٹر پاس فارسٹ آفیسر کو بتایا کہ میں نے دوایم اے کرنے کے بعد اپنے سورگباشی پتا کے کاروبار کو سنبھالا اور جب دور تک پھیلے ہوئے اپنے بزنس کا نام بتایا تو فارسٹ آفیسر کرسی سے اچھل پڑا تھا۔ اتنے بڑے بزنس کے مالک کو سادھو کے روپ میں دیکھ کر اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ الاؤ پھر سے روشن ہو چکا

تھا۔اور اس کی گرم روشنی میں کہانی نے اپنا سفر شروع کیا۔حرف حرف سچ کی آنچ پر سیک کر میں اسے کہانی سنا تا رہا، اتنا کہہ کر پھر سادھو تو چپ ہو گیا مگر میں ''اگلی بار'' کے سائبان تلے حرفوں اور لفظوں کی بوچھاڑ میں بھیگنے لگا، اور ''حلقہ میری زنجیر کا'' میرے ہی گرد تنگ ہونے لگا، میں تہی دست پھر لفظوں کی دکان کے باہر کھڑا ہو کر آنے جانے والوں کو دیکھنے لگا۔ شدت سے اپنی کم مائیگی کا احساس ہوا۔اس دکان میں کیا لفظ سجائے گئے، ہر لفظ اپنا ایک الگ مزاج، ایک الگ پس منظر ایک الگ سائیکی ایک الگ چھب اور ایک الگ کہانی رکھتا ہے۔لفظ جو خریدار بھی ہیں لفظ جو کاروبار بھی ہیں اور لفظ جو دکاندار بھی ہیں، منظر بدلتا ہے تو میں آنکھیں بند کر کے راوی کے ساتھ مل کر وہ منظر سوچنے لگتا ہوں جس منظر میں کوئی اپنے قاتل کی خوف زدہ آنکھوں میں اپنے آپ کو قتل ہوتے دیکھتا ہے۔ میرے جسم کی ساری رگوں میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑنے لگتی ہے تو میں آنکھیں کھول دیتا ہوں؛ مجھے سامنے ہی اپنے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ سجائے کھڑا سادھو ٹکر ٹکر دیکھتا نظر آتا ہے۔میں اس سے پوچھتا ہوں کیا کوئی بھی کہانی بننے والا، سوہان روح بننے والی کسی واردات کو اتنی سہولت اور اتنی مہارت سے پورٹرے کر سکتا ہے؟ کیسے ممکن ہے، سادھو خلاؤں میں دیکھتے ہوئے جیسے خود کلامی کرتا ہے ''افسانہ سینۂ محرابِ فن ہے جہاں تخلیق کے الاؤ میں فکر و تخیل کی آگ شعلہ زن رہتی ہے'' اب خلا میں دیکھنے کی باری میری ہے۔ مجھے فکر و تخیل کی آگ کا تخلیق کے الاؤ میں شعلہ زن ہونا جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے، سادھو سے پہلی ملاقات بھی تو ایک الاؤ کی دین تھی جہاں وہ پھیکے چاول مزے لے لے کر کھا رہا تھا، اسے خود سے انتقام لینا تھا، انا کو سزا دینا چاہتا تھا۔اتنا کچھ پڑھنے اتنا کچھ جاننے اور اتنا کچھ لٹانے کے باوجود

وہ شانت تھا، عجب صوفی منش سادھو تھا، یہ جو مجھے کچھ دیر پہلے اس نے چتاؤنی دی تھی نا کہ ''اگلی بار'' ایسا کچھ نہیں دوں گا کہ تم ایک کھونٹے سے ہی بندھے رہ جاؤ۔ تو یہ جو ''اگلی بار'' کی کہانیاں ہیں نا اب میں بھی بس ان ہی سے جڑے رہنا چاہتا ہوں یہ بات میں کوئی پیار دلار میں نہیں کہہ رہا ہوں یہ میری طرف سے کہانی اور کہانی کار کے خلاف ایک انتقامی کاروائی ہے، مجھے ادب کی اس بورژوائی تعریف سے لاکھ اختلاف سہی کہ ''ادب مسّرت بخشتا ہے'' مگر اب ایسا بھی نہیں ہے، کہ کوئی کہانی خود کو سکون سے پڑھنے ہی نہ دے۔ کہانی کے دشت میں اس سادھو کی معیت میں مجھے صحرا نوردی کرتے نہ جانے کتنے زمانے بیت چکے ہیں مگر اب کے جو سادھو نے مجھے ''اگلی بار'' کے کھونٹے سے باندھا ہے۔ مجھے تو شروع ہی سے کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا کہ ''اگلی بار'' سے دوستی کرنا اور رومینس کی طرف بڑھنا، دراصل کہانی کے دشت کے اُس چوتھے کھونٹ کا سفر اختیار کرنا ہے، جس کے بارے میں ساری داستانیں متفق ہیں کہ اس کھونٹ کا سفر جان جوکھم کا کام ہے، ہر قدم یہ احساس دامن گیر رہتا ہے کہ جانے انجانے مڑ کر پیچھے دیکھنے والے کو پتھر بنتے ذرا دیر نہیں لگتی۔ سادھو تو سادھو ہے اسے اپنی فکر نہیں تو کسی اور کی بھلا کیا پروا۔ پھر اسی سادھو کی روح ''اگلی بار'' کے کہانی کار نے خود ہی سویکار کی ہوئی ہے۔ اس لئے کہانی کی کوکھ میں پلنے والے ڈر، اندیشے اور خوف اگلی بار کی کہانیوں میں سانپ بن کر سرسرا رہے ہیں پھنکار رہے ہیں اور جہاں موقع ملتا ہے ڈسنے سے باز بھی نہیں آتے۔ مانو یہ یاتری کو آگے بڑھنے ہی نہیں دیتے، سو قدم قدم پر رکنا پڑتا ہے، پیچھے بہت پیچھے جانا پڑتا ہے، اسطور کی اور، ماضی کی طرف، اتیت کی جانب، اس سَم کی سمت جو ماترے گنتے گنتے ہلکان ہونے پر بھی میسّر

نہیں آتا،،قدیم داستانوں کے کتنے ہی برّاعظم پار کرنا پڑتے ہیں، کتنی صدیاں پھلانگنے پر مجبور کر دیتا ہے، کتنے سمندر کھنگالنے پر مامور کر دیتا ہے تب کہیں جا کر یاتری کو علم کے وشال ساگر سے وہ سیپی ملتی ہے جس کی کوکھ میں معانی کا وہ رتن چھپا پڑا ہوتا ہے۔ جس کی چمک میں یاتری سادھو کا ہمزاد بن کر اساطیر سے اپنے آج کی حسیات کو جوڑ کر نہ صرف 'اگلی بار' کی کہانی کے خدّ وخال اجالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے بلکہ کہانی کار کے تخلیقی اور حسی تجربات میں بھی شریک ہو جاتا ہے۔ اور ایسا ممکن ہو جائے تو کچھ بعید نہیں کہ وہ بھی اس یونانی دیوانے کی طرح 'یوریکا۔ یوریکا' چلاتا سادھو کی طرح جنگل بیلے میں بھاگنا دوڑنا شروع کر دے۔ یہ جو اگلی بار کا کہانی کار ہے نا، مانو یہ بہت بے درد، بہت سفاک اور بہت کٹھور ہے، تر سا تر سا کے کہانی خزانہ کے نقشے تک رسائی دیتا ہے، ایک ایک سٹروک میں سوسو استعارے اور اشارے ایسے گندھے ہوئے ہیں کہ جنہیں صرف کھوجنا اور کھولنا ہی نہیں خود پر منکشف بھی کرنا پڑتا ہے۔ ابھی آپ سمندر کی ڈوبتی اچھلتی لہروں میں بہتے ماضی کے صندوق سے کتاب عبرت کی چند سطریں بھی نہیں پڑھ پاتے کہ اگلے ہی لمحہ دجلہ وفرات کے استعارے ذہنی خراج لینے درد اور فراق کی کیفیات میں غرق کر دیتے ہیں، اور پھر اگلے ہی لمحے ہواؤں میں اڑان بھرنے کے لئے اڑن کھٹولے تیار کھڑے ہوتے ہیں جن کا تعاقب ایک مہیب دھماکہ کے نتیجے میں پیدا ہونے والی آواز پہاڑوں کے ہی نہیں کہانی کے یاتریوں کے دلوں کو بھی لرزا کے رکھ دیتی ہے، اور یہ منظر دیکھنے بلکہ سہنے کے بعد میں سادھو کی طرف دیکھتا ہوں اگلی بار سے پہلے پہلے وہ میری ڈھارس بندھانے ہمیشہ چوکس و تیار رہتا تھا۔ مگر اب کے وہ کہانی الاؤ کے اس کنارے دھونی رمائے اس طرح

بیٹھا تھا جیسے اگلی بار اس کے لئے گیان کے سارے ساز سر کر دیئے ہوں، یہی حال میرا تھا، ایک طویل کہانی سفر کے بعد میں اپنے آپ کو تازہ دم اور پر جوش محسوس کر رہا تھا، میں نے کھلنڈرے لہجے میں سادھو سے پوچھا۔ ہرا سمندر، گوبھی چندر، بول میری مچھلی کتنا پانی؟۔سادھو کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی پھر اس کے ہاتھ دائیں بائیں پھیلنا شروع ہوئے اور پھیلتے چلے گئے ۔۔ میں حیران ہو کر اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

2019 کے ماہ محبت کی دسویں شام

اگلی بار

کہانی کار: اویس قرنی

روایت اور جدت کے سنگم پر کھڑا جوگی

گزشتہ کل غالب کو تنگنائے غزل سے جو شکایتیں تھیں ان کا ازالہ جدید تر شاعری کے منظر نامے میں کسی حد تک کیا جارہا ہے اب شعر کے تازہ کار اس ظرف کو وسعت دینے کے لئے کمر بستہ ہو گئے ہیں اس لئے کل غزل کی خوبصورتی کو برقرار رکھنے کے لئے جو قواعد اور پیمانے اساتذہ نے قائم کر رکھے تھے ان میں سے بیشتر کو قصّۂ پارینہ سمجھ کر ان سے حتی الوسع دامن چھڑانے لگے ہیں غنیمت ہے کہ غزل کے فنی اور عروضی فریم میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ورنہ نظم کی طرح ایک زمانے میں آزاد غزل کے طرفدار بھی سامنے آئے تھے مگر بروقت واپس ہو گئے، فارغ بخاری نے تو ''غزلیہ'' کے حوالے سے پوری کتاب شائع کردی اور اس میں غزلیہ کے حوالے سے جو دلائل دیئے گئے تھے ان کو یکسر رد کرنا ممکن بھی نہ تھا ان کا کہنا تھا کہ شاعر پر تخلیق کے لمحوں میں شاذ ہی پوری غزل اترتی ہے، کبھی ایک مصرع کبھی ایک شعر کبھی ڈیڑھ مصرع اور کبھی دو اشعار کی آمد ہوتی ہے جن میں غالب کے مطابق غیب سے مضامین خیال میں آتے ہیں، اور پھر زہد و ریاضت کے زور سے شاعر کو ان مصرعوں سے ''غزل بنانا'' پڑتی ہے، اس لئے جتنے مصرعوں یا اشعار کی آمد ہو بس وہی غزل ہے، مختصر ہونے کے ناتے اسے ''غزلیہ'' کا نام دیا جاسکتا ہے، ''غزلیہ'' میں فارغ بخاری نے اسی طرح کا اپنا ایک شعر، دو اشعار بلکہ ڈیڑھ اور تین مصرعوں کے غزلیہ اکٹھے کئے ہوئے ہیں، مگر شومئی قسمت کہ نقار

خانۂ ادب میں اس طوطی کی نہیں سنی گئی سو وہ تجربہ وہیں دم توڑ گیا، البتہ ان دنوں سوشل میڈیا کا کئی حوالوں سے معروف و مقبول پلیٹ فارم جدید ٹکنالوجی کی دین ''چہرہ کتاب' 'یا فیس بک ہے، اس مکتب میں پنپنے والے بہت سے سخنور فارغ بخاری کی غزلیہ کی روایت کو آگے بڑھا رہے ہیں اور کئی ''شاعر'' اپنے ایک یا دو اشعار کو خوبصورتی سے لکھ کر اور سجا کر مقبول ہو رہے ہیں، یہ اشعار سننے میں دیکھنے اور پڑھنے میں تو اچھے لگتے ہیں کیونکہ شعر کے سارے تقاضے پورے کرتے ہیں مگر ان میں سے بیشتر اشعار میں وہ تاثیر نہیں ہوتی جو دیر تک ساتھ دینے والے اشعار میں ہوتی ہے، کوئی کوئی شعر تو منطقی ربط سے بھی عاری ہوتا ہے۔ اور اس کی وجہ شاید یہ ہوتی ہے کہ بہت سے دوست کا تا اور لے دوڑی کے مصداق شعر کہہ کر خوش ہو جاتے ہیں اور اسے دوبارہ دیکھنے کی زحمت نہیں اٹھاتے کیونکہ انہیں شعر کو سوشل میڈیا پر لگانے کی جلدی ہوتی ہے جہاں دیکھتے ہی دیکھتے انہیں بے تحاشا ''لائیکس'' اور ''واہ واہ'' کے کمنٹس ملنا شروع ہو جاتے ہیں، پھر کیا ضرورت ہے کہ وہ اپنے شعر کو دوبارہ دیکھیں حالانکہ ان میں سے بیشتر جانتے ہوں گے کہ بہتری کی گنجائش تو ہمیشہ فن پاروں میں رہتی ہے، خصوصاً ان اشعار میں جن میں سے منطق کو منہا کر دیا جاتا ہے یا جن کے مضامین میں معنوی بعد ہوتا ہے، یا پھر کسی فکری مغالطہ کے امکانات ہوتے ہیں، جہاں تک زبان کے بھید بھاؤ اور شعری حسن کا تعلق ہے تو فی زمانہ اسے تو سرے سے اہمیت ہی نہیں دی جاتی۔ یقین مانیے ایسے اشعار صرف ایک آدھ لفظ یا ترکیب کے ردّ و بدل یا نکالنے سے بہتر ہو سکتے ہیں، اور پھر وہ صرف سوشل میڈیا کے کھلنڈرے دوستوں ہی کو نہیں ادب کے سنجیدہ قاری کو بھی اپنا طرفدار بنا سکتے ہیں، مجھے یاد ہے کہ ایک بار یوسف رجا چشتی کے گھر

میں ہونے والے مشاعرہ میں صدر محفل احمد فراز تھے میں نے انہیں سٹیج پر آنے کی دعوت دی۔ وہ آئے اور مجھے کہا کہ میری ڈائری شاید لان میں رہ گئی ہے میں نے کسی سے منگوائی اور انہیں یہ کہہ کر دی تھی ''جناب یہ رہی آپ کی بیاض''۔ تو ہنستے ہوئے کہنے لگے کہ بیاض نہیں ورکشاپ میں نے ان کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا تو انہوں نے اس ڈائری کے اوراق پلٹ کر مجھے دکھائے میں نے دیکھا کہ کئی غزلوں کے اشعار اور مصرعوں کو کاٹ کاٹ کر نئے مصرعے یا لفظ لکھے ہوئے تھے۔ یہ ہمارے دور کے سب سے معتبر اور قدآور شاعر کی بات ہے جس نے ذرا بھی یہ کہنے میں تامّل نہیں کیا کہ وہ اپنے اشعار اور مصرعوں کو مسلسل دیکھتا پرکھتا اور سنوارتا رہتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ خود میں نے اوائل میں ان سے پشاور کے مشاعروں میں بارہا عمدہ غزلیں سنیں جو یاد بھی رہ گئیں اب بھی اسی طرح یاد ہیں لیکن کئی بار احباب نے مجھے کہا کہ فراز کا یہ شعر شاید اس طرح نہیں ہے جیسے آپ نے لکھا یا پڑھا ہے میں فوراً مان جاتا ہوں کہ وہ درست کہہ رہے ہیں کیونکہ جو اشعار میری یادداشت میں محفوظ ہیں وہ میں نے خود احمد فراز سے نیشنل سنٹر پشاور کے مشاعروں میں اسی طرح سنے ہیں مگر ان کی کتب ''نایافت اور دردآشوب کے بعد کے ایڈیشنوں اور خصوصاً جاناں جاناں'' میں وہ اس طرح نہیں ہیں، بہت سے مطلعے تبدیل کر دیئے گئے ہیں، گویا فکر سخن کا سلسلہ تو شعر کہنے اور سنانے کے بعد بھی جاری رہتا ہے، کہ شعر گوئی ایک کارِ مسلسل ہے اسی طرح بڑے شعرا نے جو بھی لکھا اسے شائع نہیں کیا بلکہ کڑا انتخاب کر کے اپنا دیوان ترتیب دیا اور اس فہرست میں نمایاں نام شاعروں کے گرو غالبؔ کا بھی ہے۔ انہوں نے تو ایک ہاتھ آگے بڑھ کر یہ بھی کیا کہ ایک مدت تک اسدؔ تخلص کے ساتھ شعر کہتے کہتے اس تخلص

کو بھی ترک کر دیا اور غالبؔ رکھ دیا، اور آج تو صورت حال یہ ہے کہ کچھ ایسے احباب کو میں جانتا ہوں کہ وہ اپنے شعر یا مصرعے میں توجہ دلانے کے باوجود محض اس لئے تبدیلی نہیں لاتے کہ اس طرح توجہ دلانے والے سے ان کا قد چھوٹا ہو جائے گا، تاہم ایسے قد آور شعرا کی بھی کمی نہیں کہ ان کی سینیارٹی کا جن ایسی باتوں سن کر کبھی بوتل سے باہر نہیں نکلتا اور وہ بڑی خوشدلی سے نظر ثانی کی حامی بھرتے ہیں۔ لیکن ایسے شعرا بھی ہمارے آس پاس موجود رہتے ہیں جو میر تقی میر کی طرح برملا کہتے ہیں کہ

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

اور میر انیس کی طرح ان کا بھی دعوی یہی ہوتا ہے کہ ''اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں'' چلئے یہ بھی گوارا مگر کچھ تو اقبال ساجد کے ہم نوا بن جاتے ہیں جس نے ترنگ میں آ کر کہہ دیا تھا

ندیم و فیض و فراق و فراز کچھ بھی نہیں
نئے زمانے میں ان کا جواز کچھ بھی نہیں

خیر وہ تو اقبال ساجد تھے اب تو فرزندِ آذر کی طرح ہر شخص نے دین بزرگاں خوش نہ کرد کی مالا جپنا شروع کر دی ہے تا کہ سورج ڈھلنے سے پہلے ہی چار دانگ عالم سے خراج حاصل کر لے۔ لیکن بڑا سچ یہی ہے کہ شعر کے لئے مسلسل ریاضت بھی درکار ہے، اور نئے مضامین کے لئے راستے ہی نہیں دل و دماغ بھی کشادہ رکھنا پڑتے ہیں اور پھر شعر کہنے کے بعد بھی اس سے رومینس جاری رکھنا لازمی ہوتا ہے۔

لیکن میں نے کہا نا کہ یہ جو، اب شاعری کا نیا بیانیہ ترتیب پا رہا ہے اس سے ایک شگفتگی

اور تازگی کا احساس تو ضرور ہوتا ہے لیکن جانے کیوں اس کی تاثیر میں وہ ادبی چاشنی گھلی ہوئی نہیں لگتی جو روایت سے جڑے ہونے کی دین ہوتی ہے۔ یہ آوازیں سماعتوں کو بھلی بھی لگتی ہیں تاہم ان کے ساتھ دوستی کم کم ہی، دیر تک چلتی ہے اس کی ایک وجہ شاید شاعری کی کلاسیکی روایت کی وہ تربیت ہے جس نے میری نسل کے لوگوں کو تھوڑا سا منتخبہ اور تھوڑا سا تھڑ دلا بنا دیا ہے، جبکہ تازہ کار، شعر کے منظر نامہ میں جدید حسیات کے رنگ بھرنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے تھوڑی بہت رعایت کو بہت جائز گردانتے ہیں، میں نے خود کو ہمیشہ اس نئے بیانیہ کا طرفدار پایا اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مرحوم احسن سلیم کے سہ ماہی اجراء، کراچی کے ذریعے کی گئی شعوری کوششوں سمیت اطراف سے گاہے گاہے اٹھنے والی آوازوں کے باوجود کسی واضح ادبی یا ذہنی تحریک کی عدم موجودگی کی وجہ سے سارا ادبی منظر نامہ خالی خالی سا لگنے لگا ہے۔ اور اب تو جانے انجانے میں روایت سے شعوری گریز نے اس کے خدوخال کو دھندلا دیا ہے اس نقصان کا البتہ فائدہ یہ ہوا کہ نئے آنے والوں کے پاس بجز اس کے کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ روایتی راستے اور منزلیں تلاشنے کی بجائے اپنے لئے نئے راستے اور منزلیں تراشنے لگیں چلئے مان لیجئے کہ ''کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد'' اور یہ مان لینے میں بھی حرج نہیں ہے کہ جدید تر بیانیہ ترتیب دینے کے اس عمل میں تھوڑی بہت توڑ پھوڑ تو ہوگی، جس پر ناک بھوں چڑھانے کی بجائے غالب سے رجوع کر لینے ہی میں عافیت ہے جس نے بہت پہلے ہی کہہ دیا تھا،

با من میآویز اے پدر، فرزندِ آذر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر، دینِ بزرگاں خوش نکرد

اس صورت حال میں روایت سے جڑی شاعری کے علمبردار تو بارے آرام سے ہیں کہ وہ اپنے حصے کا بہت سا کام کر چکے ہیں مگر مزے کی بات یہ بھی ہے کہ شعروادب کی وادی میں قدم رکھنے والے تازہ کار بھی مطمئن ہیں کہ انہوں نے اپنے لئے نئی راہوں کا تعین کر لیا۔لیکن جو سخن ور، روایت اور جدت کے سنگم پر کھڑے شعری اظہار کر رہے ہیں۔ان کے لئے آج کا یہ نیا شعری بیانیہ ایک ادق مشق اور ایک گنجلک تجربہ ہے ان کی جان پر اس لئے بھی دہرا عذاب ہے کہ وہ روایت سے انگلی چھڑائے بغیر نئے منظر نامہ کا حصہ بنے ہوئے ہیں اور جو جوگی اس سنگم پر پورے یقین سے دھونی رمائے بیٹھے ہیں ان میں ایک پُر گو، مست والست اور جی دار جوگی حسام حر ہے، جو اپنی تمام تر ترقی پسندی، تازہ کاری اور جدت طرازی کے اپنے نئے شعری پڑاؤ کو ''حسن تغزل'' کے نام سے موسوم کرتا ہے۔اور اس کی سیر پر نکلنے والوں کو دونوں موسم گدگداتے ہیں، گزشتہ کل کا رکھ رکھاؤ اور ملائمت کا موسم اور آج کے دوٹوک اور سفاک سچ کا کٹھور موسم، پہلے موسم میں چیزوں کو جیسا ہونا چاہئے کی ہوا چلتی ہے جب کہ دوسرے موسم میں جو ہے جیسا ہے کی بنیاد پر اشیاء کو دیکھا اور دکھایا جاتا ہے۔اور یہ دونوں موسم ساتھ ساتھ اپنی چھب دکھاتے آگے بڑھتے ہیں انہیں حسن تغزل کا عمومی لہجہ آپس میں جوڑے رکھتا ہے جو محرومی، دکھ اور نارسائی سے عبارت ہے، یہ لہجہ تخلیقی کرب کی شدت کو کچھ ایسے نمایاں کر دیتا ہے کہ شعر کہنے والا اور پڑھنے والا دونوں بے یقینی کی دھند میں گم ایک دوسرے سے اپنی آنکھ کے آنسو چھپا رہے ہوتے ہیں مگر شعر کہنے والا فوراً ہی اس کیفیت سے اپنی بریّت کا اعلان کرتا ہے کہ اسے راستہ بھی دکھانا ہے۔البتہ پڑھنے والے کے لئے یہ کیفیت بیک وقت عارضی بھی ہوتی ہے اور مستقل بھی عارضی

یوں کہ کبھی تو قاری فوراً سر جھٹک کر آگے بڑھ جاتا ہے اور مستقل ایسے کہ اس کو بھی لاتعلقی کا لا علاج روگ لگ جاتا ہے اور پھر وہ اسی کیفیت میں خوش رہنے لگتا ہے۔ حسام حراس سفاک حقیقت سے آگاہ ہے اس لئے وہ محرومی اور نارسائی کے دکھوں کا بیان کرتے ہوئے شعوری کوشش سے اپنے شعری اظہار کو، خوش خیالی، مثبت گمانی اور خوش امیدی کا جامہ پہنا کر اپنے لوگوں اپنی جماعت اپنے ترقی پسند قبیلے کے احساسات و جذبات کی تصویر بنانے کی سعی کرتا ہے، دکھوں سے مغلوب ہو کر ان کے تدارک کا حل سوچنا مایوسی کو بڑھاوا دیتا ہے اس لئے حسام حر ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا ہے۔ محرومیاں اور نارسائیاں اسے جتنا جذباتی بناتی ہیں وہ اپنے قاری کے لئے ان کا اظہار اتنا ہی غیر جذباتی انداز سے کرتا ہے۔ یہ ایک مختلف پیرایۂ اظہار ہے، کچھ دکھانے اور کچھ چھپانے کا یہ انداز محض شاعرانہ رمز و کنایہ نہیں ہے چیزوں کو اونچے پیڈسٹل سے دیکھنے کی کوشش ہے جہاں سے بظاہر وہ دسترس میں دکھائی دیتی ہیں اور جن پر قابو پانا ایک مشکل چیلنج سہی مگر ناممکن نہیں کیونکہ اس شعری اظہار سے کہنے اور پڑھنے والا ایک دوسرے سے آنسو چھپانے کی بجائے ہاتھ میں ہاتھ دے کر محرومیوں اور نارسائیوں کے خلاف صف آرا ہو جاتا ہے۔ اس سے ایک نقصان ضرور ہوتا ہے کہ بسا اوقات کچھ سبکساران ساحل کے نزدیک نئی شعری حقیقت کے اس طرح کے دوٹوک اظہار پر غیر شعریت اور سٹیٹمنٹ کا الزام لگانا سہل ہو جاتا ہے یہ اس بات کی علامت ہے کہ الزام لگانے والے نئی شاعری کو زمانی سیاق و سباق سے الگ کر کے خالصتاً روایتی پس منظر میں دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ حسن تغزل کے شاعر کو میں اس لئے بھی ایک خود آگاہ شاعر سمجھتا ہوں کہ اس کے پیش نظر یہ سارے تحفظات

ہونے کے باوجود اس نے اپنے مقصد کی ترسیل کو مقدم رکھتے ہوئے اور معاشرتی اور سیاسی پیچیدگیوں کو بسر کرتے ہوئے نیا شعر بنا ہے۔ اس کے ہاں زیریں سطح پر جو خوش آئند زمانوں کے خواب، ہلکورے لیتے نظر آتے ہیں، وہی خواب دراصل اس کے اپنے لوگوں اور جماعت کے لئے سنہرے دنوں کی تعبیر بھی ہیں اس لئے وہ پورے تیقن سے کہتا ہے کہ

دور سے آتی ہوئی آواز گونجے گی یہاں
دور سے آتی ہوئی آواز میں ہے روشنی

اس شعر میں اور حسن تغزل کے اس طرح کے ان گنت اشعار میں حسام حر کا وژن اور اس میں سانس لیتا ہوا موضوعی اور معروضی حقائق کا ادراک قاری کو خود اپنی طرف کھینچتا ہے، اس پر مستزاد، اس کا کرافٹ مین شپ جو پڑھنے والوں کو شعر پڑھتے ہی اس کا طرفدار بنا لیتا ہے۔ اس شعر میں بات پہنچانے کے لئے اس نے جو دو ''ٹول'' استعمال کئے ہیں وہ آواز اور روشنی ہیں۔ یہ دو لفظ اپنے اندر معانی کا ایک جہان آباد رکھتے ہیں، بگ بینگ سے لے کر موسموں کی عمومی تبدیلی تک کے سارے مناظر کے پس منظر میں آنے والے زمانوں کی ساری خبریں ان دو لفظوں کی گٹھڑی میں بندھی ہوئی ہیں۔ غالب کے بیان کردہ سہل ممتنع کی تعریف پر پورا اترتے ہوئے یہ شعر فوراً دوستی کی طرف ہاتھ بڑھانے لگتے ہیں، میں نے کہا نا کہ یہ مختلف پیرایۂ اظہار ہے، جو روایت اور جدت کے سنگم پر جنم لے رہا ہے۔ ایسے شعر قدم قدم پر آپ کو روک لیتے ہیں اپنا نام بتاتے ہیں تعارف کراتے ہیں اپنا درد آپ سے شیئر کرتے ہیں اور آپ سے کہلواتے ہیں کہ جو آپ نے ان کے خدوخال سے اندازہ لگایا تھا' شاید وہ اس سے

کہیں مختلف کیفیت کے حامل ہیں۔

کونج کرلاتے ہوئے بھرنے لگی ہے دائرے
ایک مدت بعد گھر کو واپسی کی ایک شام

اس پیراڈوکس کو دیکھئے کہ کونج کا کرلانا 'بچھڑنے کی تصویر' بنتی ہے اور مدت بعد گھر واپسی، مراجعت 'ملنے کی نوید' ہے، دیکھئے کہ بظاہر دو لخت کیفیات کے حامل یہ دو مصرعے کیسے مربوط ہیں، کتنا گھمبیر اور دل کو چھونے والا اظہار یہ ہے، کیسی جذباتی کیفیت کا اظہار ہے، کیسی پینٹنگ بنی ہے جس میں اداسی کے ہلکے اور سرشاری کے تیز رنگ ایک دوسرے میں ضم ہو گئے ہیں۔ یہیں سے حسام حر کا وہ لہجہ بنتا ہے جو اپنے لوگوں اور اپنی جماعت کے زخموں کو بیک وقت کریدتا بھی ہے اور پھاہے بھی رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک دونوں عمل ضروری ہیں، زخم کا کریدنا انہیں اس درد اور کسک سے آشنا کرنا ہے جس کی وجہ سے انسانیت کراہ رہی ہے اور پھاہے رکھنے سے ملنے والا سکون ان کو آنے والے اچھے دنوں کے سکھ کا ادراک بخشتا ہے۔ اس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں رہتا کہ حسام حر شعر بنتے ہوئے خود کو جاب پر محسوس کرتا ہے، وہ جو گذشتہ کل ٹیگور نے کہا تھا کہ شاعر تو محض سروں کے مزے لیتا ہے حسام حر اس بورژوائی سوچ کو خود سے جھاڑ کر شعر کے معبد میں داخل ہوتا ہے

غزل میں لفظ بہت عام ہو گئے ہیں حرؔ
تم اس مقام سے آگے چلو گزر جاؤ

حسن تغزل کے پڑاؤ پر حسام حر نے جو سوالات اٹھائے ہیں ان میں بیشتر کے جوابات حسن تغزل کی ذرا سی دلسوزی کے ساتھ سیر کے دوران ہی مل جاتے ہیں البتہ کچھ

استفسار اس نے ان لوگوں سے کئے ہیں جن کا تعلق اس گروہ سے ہے جنہیں ''سچی کتاب'' میں جاننے والے کہا گیا ہے۔ یہ سوال اہم بھی ہے اور معتبر بھی اور کسی جاننے والے کے دل کا دروازہ اگر اس سوال کی دستک سے کھل گیا تو شاید چاروں اور پھیلی بے چینی، بے یقینی اور زندگی کی بے اعتباری کے اسباب کا علم سب کو ہو جائے گا مگر جب تک یہ سب نہیں ہو جاتا آیئے! تب تک اس سوال کا جواب میں اور آپ اپنے اپنے دل میں ڈھونڈنے کی سعی کرتے ہیں۔۔۔۔

ایک روشن دان میں کتنے اندھیرے ہیں نہاں
کوئی مرشد جانتا ہے تو بتاتا کیوں نہیں

دسمبر 2016 کی دسویں صبح

حسن تغزل
شاعر: حسام حر

اعصاب شکن رائیڈ

ارم ہاشمی جی۔ پتا ہے ابھی کچھ ہی دن قبل شوبز کی ایک تقریب تھی، میں جب بیک سٹیج پہنچا تو ایک فنکارہ بھاگ کر میرے پاس آئی، دراصل چند برس پہلے اُسے میں ہی شوبز کی دنیا میں لایا تھا، بہت کم عرصے میں وہ بہت مقبول ہوچکی ہے، بہت دنوں بعد ملی تھی اس لئے میں نے پوچھا، شادی ہوگئی۔ وہ چھوئی موئی سی لڑکی جیسے بجھ سی گئی اور سر جھکا کر کہنے لگی، انکل! سب جھوٹے ہیں، کوئی کسی کا نہیں، چھوڑیں جی آپ اپنی سنائیں، کوئی نیا ڈرامہ لکھ رہے ہیں؟ اس نے بڑی صفائی سے بات بدل دی، اس رات میں دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا، یہ وہی دن تھا اور میں اسی کیفیت میں بھیگا ہوا تھا جب آپ کا ناراضی میں لپٹا ہوا ایک میسج ملا'' میں مبتلا شخص لکھنا تو کجا، ابھی تک آپ کے بھیجے ہوئے افسانے پڑھ بھی نہ پایا تھا، تب اسی کیفیت میں شرابور میں نے آپ کے افسانے نکالے تو ایک افسانے کے عنوان نے جیسے چپ ہی کرا دیا۔ ایک انجانے خوف نے مجھے گھیر لیا، کہ جس فنکارہ کی وجہ سے میں ڈیپریشن کا شکار تھا کہیں یہ افسانہ اس میں مزید اضافہ نہ کردے۔ پھر بھی جی کڑا کر کے میں نے آپ کا افسانہ 'بن بیاہی' پڑھا،، ارم جی! میرے ساتھ 'بن بیاہی' نے، کچھ بہتر سلوک نہ کیا، میں نہیں جانتا کہ یہ کہانی بنتے ہوئے آپ کے ذہن میں عدن کے کیا خدوخال ابھرے

ہوں گے، اور اسے لکھتے ہوئے آپ خود کس کرب سے گزری ہوں گی مگر میں نے تو کہانی کے شروع ہوتے ہی عدن اور کہانی کی راوی، افسانے کے دونوں کرداروں سے اُنگلی چھڑالی تھی کیونکہ اس کہانی کے خارزار میں پا برہنہ چلتے ہوئے، عدن کی بجائے، میں اس شمع رو فنکارہ کو قطرہ قطرہ پگھلتے دیکھ اور سن رہا تھا۔ کبھی کبھی کہانی کے کینوس پر مجھے وہ بھی صاف دکھائی دینے لگتا جو عدن کی کہانی میں نہیں تھا، بار بار غیر محسوس طریقے سے اس چھوئی موئی فنکارہ کی سرگرمیاں کہانی میں شامل ہو جاتیں، اکثر رات گئے، وہ فنکارہ تقریبات کے ختم ہونے کے بعد کبھی ایک کبھی دوسرے ساتھی فنکار کی گاڑی میں بیٹھ کر گھر جایا کرتی مگر کبھی کبھار ایسے لڑکوں کے ساتھ بھی چلی جاتی جن کو میں ہی نہیں ساتھی فنکار بھی نہیں پہچان پاتے تھے، اور اس کے ساتھی فنکار مسکرا کر ایک دوسرے کے کان میں سرگوشیاں کرنے لگتے، ارم جی کہانی کو میں نے پڑھا ہی نہیں، مانو سہا بھی ہے پھر اختتام پر آپ نے جس کمال مہارت سے کہانی کو ادھورا چھوڑ کر ایک سادہ سے جملہ سے افسانہ مکمل کیا ہے یعنی۔۔۔'' ۔۔وہ بن بیا ہی ہے''۔۔ان لفظوں میں وہ ساری اذیّت اور کرب بھرا ہوا تھا۔۔ جو اس فنکارہ نے بجھتے چہرے اور دھوئیں سے بھری آنکھوں کے ساتھ سر جھکا کر مجھے کہا تھا۔''سب جھوٹے ہیں، کوئی کسی کا نہیں''، اور جس نے میرے سانس چھوٹے چھوٹے کر کے مجھے ادھ موا سا کر دیا تھا، کیونکہ وہ بھی بن بیا ہی ہے۔ارم جی! پھر کتنے ہی دن تک مجھے آپ کے باقی افسانے پڑھنے کی ہمت نہیں ہوئی، آپ کی ناراضی کا خوف نہ ہوتا تو شاید کبھی نہ پڑھتا، مگر اب آپ کے افسانے پڑھنے کے بعد سوچتا ہوں کہ اگر واقعی آپ کے یہ دل کو کہیں بہت اندر سے چھوتے افسانے نہ پڑھتا تو شاید خود

کو کبھی معاف نہ کر پاتا، ارم جی! جب میں نے آپ کی کہانیوں سے دوستی شروع کی، تو پتا ہے پھر بھی ایک نشست میں ایک سے زیادہ افسانہ پڑھنے کی ہمت نہیں ہوئی، ہر افسانے کے بعد مجھے بہت دیر تک چپ ہونا پڑا تھا، مجھے کہنے دیں کہ میں نے سادہ بیانیہ کہانی میں اتنا عمدہ کرافٹ بہت کم دیکھا ہے موضوع سے گریز کرتی آپ کی کہانی واقعات کو ایک نئی ترتیب دیتے ہوئے پڑھنے والے کو مسمرائز کر کے پہلے کسی اور منطقہ میں پہنچا دیتی ہے اور پھر اچانک اسے واپس لا کر کہانی کے غیر متوقع مگر منطقی انجام سے حیران کر دیتی ہیں، اور یہ تکنیک کم و بیش ہر کہانی میں ایک بھرپور رچاؤ کے ساتھ آپ نے برتی ہے۔ جیسے ''بانجھ'' کا سارا قصہ کثرت اولاد سے متعلق ہے کہانی کے سارے شیڈز اسی موضوع کی پریشانیوں کے خدوخال ابھار رہے ہوتے ہیں اس لئے پڑھنے والا بلقیس خانم کا طرفدار ہو جاتا ہے اور پھر اسی لمحہ کہانی میں اچانک ایک دھماکہ ہوتا ہے۔

''منہ جلوں کا کہنا تھا کہ بلقیس خانم بانجھ ہیں۔ ہاہا!! بانجھ! بانجھ!!''

یہی تکنیک آپ نے کم و بیش ساری کہانیوں میں برتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک ایک کہانی کے خدوخال اسی طرح ابھارتا ہوا آگے بڑھوں مگر یہ سہل پسند زمانہ کہیں آپ کے کہانی پڑھنے کی لذت سے محروم نہ ہو جائے، مجھے کیبرے ڈانسر کی اختتامی سطر نے بھی چپ کرا دیا تھا، میں اسے ہر حوالے سے ایک بولڈ کہانی اس لئے بھی قرار دے رہا ہوں کہ آپ نے سمندر میں رہتے ہوئے کچھ سوڈو دانشوروں کو للکارا ہے، یہی کام اتنی ہی جرأت اور بہت سہولت کے ساتھ ناموری'' میں بھی کیا ہے، ارم جی سچ بھلے سے کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو کسی کو تو اس کے لئے زہر پینا ہی پڑتا ہے، کوئی تو ہو جو اس ڈرامہ

کے کرداروں کے چہروں کو بے نقاب کرے، اس طرح یہ میاں لوگ میں آپ نے جس کمال سے معاشرے کے عام کردار سے ادبی دنیا تک کے دانشوروں تک کے رویّوں کی تصویریں بنائی ہیں وہ بہت کچھ سوچنے پر راغب کرتی ہیں پھر کہانی کی بُنَت کا جو ہنر آپ کو ودیعت ہوا ہے وہ کہانی کی سطروں سے اُٹھ اُٹھ کر آپ کے روشن مستقبل کی گواہی دیتا ہے۔

''میاں ساتھ نہیں آئے؟'' ان کا تجسس اپنی جگہ قائم تھا۔

''میری شادی نہیں ہوئی''۔

''ہائیں!! وہ متحیر ہو کر اس زور سے چیخیں کہ گود کا بچہ گرتے گرتے بچا۔

اَب میں آپکو اِن کاغذوں میں کس طرح بتاؤں کہ اُنھوں نے کس قدر رحم بھری نظروں سے مجھے دیکھا''

اب دیکھیں کہ جب کردار تنگ آ جاتا ہے تو کیسے پڑھنے والے سے مکالمہ شروع کرتا ہے۔ (اَب میں آپکو اِن کاغذوں میں کس طرح بتاؤں کہ اُنھوں نے کس قدر رحم بھری نظروں سے مجھے دیکھا) مجھے اس افسانے کی آخری سطر میں ''گدھا'' بہت معنی خیز لگا یہ محض ''زچ'' ہونے کے بعد کی کیفیت نہیں لگتی۔ اس طرح نجومی کی کہانی بھی پڑھنے والے سے کھلواڑ کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے اور انجام پر چپ کرا دیتی ہے۔ مجھے یہ علم تو ہے کہ شعر ہو یا فکشن پڑھنے والے کو اگر ایک سٹیٹ آف مائینڈ سے دوسرے سٹیٹ آف مائینڈ میں ٹرانسپورٹ نہ کر سکے تو مان لیں تخلیق کی ٹریٹمنٹ میں کہیں کچھ کمی رہ گئی ہے، مگر آپ کے یہ مختصر افسانے تو ایک ذہنی کیفیت سے دوسری میں پہنچانے کے بعد بھی مسلسل کچوکے دیتے ہوئے آخر آخر میں پھر سے ایک نئی ذہنی

کیفیت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ میں نے بہت کم افسانوں کو اپنے پڑھنے والے کے ساتھ یہ کھیل کھیلتے دیکھا ہے۔سادہ بیانیہ انداز کی کہانی جس کے کئی شیڈز ہیں مگر آپ، کہانی پر غیر ضروری فلسفہ چھڑکتی ہیں اور نہ ہی ابہام سے اپنی کہانی کو چیستان بناتی ہیں معنی آفرینی ضروران کہانیوں میں نظر آتی مگر وہ بھی پڑھنے والے کے فہم وادراک پر کسی قسم کا بوجھ نہیں ڈالتی، کہانی اپنی تخلیق کے بہاؤ میں آگے بڑھتی ہے، پڑھنے والے کو ساتھ لے کر چلتی ہے،اور تحریر کی شگفتگی جیسے متحرک تصویریں بناتی چلی جاتی ہے، یہ افسانوں کے البم سے زیادہ مجھے سماج کے دہرے چہروں کے ساتھ زندگی کرنے والے کرداروں کی بری بھلی اور بھدی تصویروں کی آرٹ گیلری لگی۔اور جس نے مجھے بہت دیر تک ایک ایسی دھندلی روشنی میں سانس لینے پر مامور رکھا جو مجھے یقین ہے کہ بہت دیر تک میری ذہنی و قلبی کیفیتوں میں میری ہم سفر رہے گی۔مان لو آپ کی ہر کہانی مجھے ایک اعصاب شکن رائیڈ لگتی ہے، جسے پڑھنے کے بعد دیر تک اعصاب سہلانے پڑھتے ہیں،۔۔ارم جی۔اجازت۔۔۔۔

2019 مئی کی 16ویں شب

کافی ہاؤس

کہانی کار۔:ارم ہاشمی

گھر، سفر رستہ اور پورے سچ کا خوابِ دِگر

۔۔۔اور جب سارے میں نامانوس بو پھیلتی جاری ہو تو آنگنوں میں لاتعلقی کے سانپوں کی پھنکار کا زرو موسم ڈیرے ڈال لیا کرتا ہے ایسی ہی غیر یقینی عصری صورتِ حال اور منفی رویوں کی آب و ہوا میں سانس لینے پر ہم مامور کردیئے گئے ہیں اور ایسے میں کوئی بھی سچا تخلیق کار سوچتا ہی رہ جاتا ہے کہ وہ اپنے ہونے کا یقین خود کو دلائے یا پھر ان بے اماں لمحوں کو جنہیں خود اپنے وجود کی کہیں سے بھی ضمانت نہیں مل رہی وہ تہذیبی اقدار کی موت کا نوحہ لکھے یا پورے سچ کی تلاش میں جان لیوا سفر پر نکل پڑے جس پر پیچھے مڑ کر دیکھنے والے پتھر کے ہو جاتے ہیں۔ پورے سچ کی تلاش میں ایسا ہی ایک ہلکان کردینے والا سفر الیاس بابر اعوان کو بھی درپیش ہے اور اس کیلئے یہ سفر کسی بھی دوسرے مسافر سے زیادہ دشواریوں ہے کہ وہ سفر کا خُوگر ہونے کے باوجود اپنے اندر کی تہذیب سے ہوم کمنگ کا شکار ہے مگر حرام ہے کہ جو وہ اس خواہش کو کہیں بھی زیادہ لاؤڈ کرنے کی سعی کرتا ہو۔ وہ گھر کا ذکر کر بھی دے تو وہ اسکا ایک دریچہ گاؤں کی طرف کھلا رکھتا ہے جہاں سے گندم کی مہک اسے سرشار کرنے آتی ہے۔

چار سو رہتی ہے میرے گھر میں گندم کی مہک
گھر میں اک کھڑکی کھلی رکھتا ہوں گاؤں کی طرف

چونکہ اب اس گھر آنگن میں فصلیں اُگ آئی ہیں تو گھر رہنے کی بجائے مجبوراً انھیں سفر کو گلے لگانا پڑتا ہے۔ میں نے جو چند ایک دن ان کی غزلوں کے ساتھ گزارے ہیں تو ان میں جہاں سفر کا استعارہ جان کو آتا ہے وہاں دیوار و در اور گھر کی علامتیں بھی کسی بند مکان کے درِ حیرت پر ایستادہ نظر آتی ہیں۔ الیاس بابر اعوان کی ساری تخلیق، ریاضت اور قوت ان راستوں کی دین ہے جن پر چلتے ہوئے وہ کسی بھی لمحے بے مزا نہیں ہوتے۔ وہ سفر کو زندگی اور زندگی کو طلسمِ سفر گردانتا ہے۔ انھیں یہ بھی علم ہے کہ سمندر میں اُتر جانے سے پہلے سارے دریا سفر کی قید میں ہوتے ہیں اور یہاں بھی دریا اور سمندر اپنے وسیع تر معنوں اور سامنے کی علامتوں کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ سفر، حرکت، چلنا، قافلہ، رستے، مسافر اور وقت سے ہی وہ اپنی شاعری کا منظر نامہ تشکیل دیتا ہے مگر نجانے مجھے وہ اس سب کچھ کے باوجود گھر کا قیدی کیوں نظر آتا ہے غیر محسوس مراجعت کا احساس کہیں کہیں نمایاں بھی ہو جاتا ہے۔

در و دیوار میں ہے ماں کی خوشبو
میں رو پڑتا ہوں گھر جانے کے بعد

مگر اپنے جمالیاتی احساس کی لَو کو اونچا کرتے ہوئے وہ مسلسل اسی پورے سچ کی تلاش میں ایک نہ ختم ہونے والے راستے پر اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ راستے تو انھیں ہلکان کرتے رہتے ہیں مگر وہ منظر دیدنی ہوتا ہے جب سفر ان سے بیچ رستے انگلی چھڑا لیتا ہے اور وہ حیران و سرگرداں کہہ اُٹھتے ہیں

رُکا ہوا ہے لبِ دشت اک ہجوم عزا
سو قافلے کہیں رکھ کر سفر چلے گئے ہیں

سفر کے پھول کو الیاس بابر اعوان نے سو رنگ سے باندھا ہے اور ہر بار اس کی تخلیقی قوت نے اسے سُرخرو کیا ہے یہ جو، اب شاعری اور اُردو شاعری کو نئی نسل کی توانا اور باشعور آوازیں میسر آ گئی ہیں اس نے شاعری کو کھلی فضا میں سانس لینے کا ہنر سکھلا دیا ہے۔ پرانے شہر کی فصیلوں میں دراڑ پڑنے اور نئی بستیاں آباد ہونے کے راستوں میں کمندیں ڈالنے والے اب اپنی دکان آگے بڑھا گئے ہیں کہ نئی بستیوں کے رہنے والوں کے اندر کہیں پرانا شہر بھی آباد رہتا ہے اِسی طرح نئی شاعری کے آنگن میں بیتے ہوئے سمے کی چاپ سنائی دیتی ہے بس ذرا سی دوستی کی دیر ہوتی ہے اور الیاس بابر اعوان کو بھی اس بات کا ادراک ہے کہ دیوار کو در بننے میں کچھ وقت لگتا ہے، لیکن بدقسمتی سے نئے شاعر کے کام کو پرکھنے والے کچھ دانشور تازہ ہوا کے رخ پر کھلنے والے دریچوں کو بند کر کے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں اور بیک جنبشِ قلم ایسے بہت سے حوالوں کو رد کر دیتے ہیں جو ان کے لیے اجنبی، ناموس اور قدرے مشکل ہوتے ہیں اور شاید ان کے پیش نظر شکنتلا کے خالق کالی داس کے ایک ڈرامے مالویکا اگنی متر کا یہ شعر نہیں رہا ہوتا جس کا ترجمہ عرفان صدیقی نے کچھ یوں کیا ہے۔

اچھی ہوتی نہیں ہر چیز قدامت کے سبب
اور نئی ہونے سے ہر شے نہیں ہوتی ہے خراب

اور ان کا تازہ کاروں میں اردو اور انگریزی زبان و ادب سے آشنا الیاس بابر اعوان جب پورے سچ کی تلاش میں نکلتے ہیں تو لگے بندھے رستوں پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ وہ اپنے لئے نئے راستے ہی نہیں نئے سفر بھی تخلیق کرتے ہیں۔

ہم ایسے بادباں فطرت کہ ہاتھوں کی لکیروں میں
سمندر کے جزیروں کا سفر تخلیق کرتے ہیں

مجھے خوابِ دگر کی غزلوں نے بہت سرشار کیا ہے۔ دیر دیر تک ہم نے ایک دوسرے بات کی ہے اور بعض غزلوں سے تو میں نے باقاعدہ رومانس بھی کیا ہے۔ آپ بھی الیاس بابر اعوان کے خوابِ دگر میں کھو جائیے اور مجھے اس غزل کے ساتھ ایک بار پھر رومینس کرنے دیجئے۔

رستہ بھولا جا سکتا ہے، رستے میں
اور اک رستہ آ سکتا ہے رستے میں
لوگوں کی یہ بھیڑ نگل بھی سکتی ہے
رستہ مجھ کو کھا سکتا ہے رستے میں
رستے میں اک جادونگری آتی ہے
سایہ بھی پتھرا سکتا ہے، رستے میں

خوابِ دگر
شاعر: الیاس بابر اعوان

مسافروں کے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں

یہ جن سیلانی طبیعت کے لوگوں کے پاؤں میں چکر کی بات کی جاتی ہے تو مجھے گماں گزرتا ہے کہ ان میں سے کچھ ایسے بھی ہوں گے جن کے پاؤں میں بھنور بندھے ہوتے ہیں جانے کیوں مجھے لگتا ہے کہ جن کے پاؤں میں چکر ہوتا ہے اس میں کچھ عمل دخل ان کے اپنے ارادے کا بھی ہوتا ہے جب کہ بھنور میں گھرے شخص کے ساتھ جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ بھنور ہی کرتا ہے گویا وہی اسے اپنی ترنگ میں لئے لئے پھرتا ہے۔اور پھر سیلانی طبیعت شخص کو پیڑ گننے سے کچھ دلچسپی نہیں ہوتی۔اسے تو بس ذائقہ کی للک ہوتی ہے،اور سیر کا ذائقہ ایک بار منہ کو لگ جائے تو اس کے سسٹم میں ھل من مزید کا ورد فعال ہو جاتا ہے،کل غالب نے کہا تھا

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

تسلیم،لیکن نہ جانے کتنی صدیوں سے شب و روز گردش میں رہنے والا آفتاب پوری آب و تاب سے بلا تکان سفر کرتا ہوا اِدھر ڈوبا اُدھر نکلا اُدھر ڈوبا اِدھر نکلا کی مشق جاری رکھے ہوئے ہے اور گردشِ مدام کے باوجود چمک دمک رہا ہے،اور یہ بات تو طے ہے کہ ناموں کا انسان کی شخصیت پر بلا کا اثر ہوتا ہے،اس لئے اگر آفتاب اقبال بانو کی اضطراری اور آفتابی طبیعت انہیں کہیں چین سے بیٹھنے نہیں دیتی تو کہانی کچھ کچھ سمجھ میں

آنے لگتی ہے، سفر ان کا اوڑھنا بچھونا ہے لگتا ہے مولانا حسرت موہانی کی طرح ان کا سفری بیگ بھی ہمہ وقت بندھا پڑا رہتا ہے، نئی زمینوں کی سیر اور نئے جزیروں کی یاترا ان کا اور شغل ہی نہیں عشق بھی ہے اور یہ وہ عشق ہے جس میں وہ بڑی دریا دلی سے سب کو شریک بھی کرنا چاہتی ہے اس لئے مزے لے لے کر ان نئی دنیاؤں کی سفر کہانی سناتی ہے اور اپنے دلکش اور شگفتہ اسلوب اور دلنشیں طرز نگارش سے اپنے پڑھنے والوں کو بھی ان علاقوں کے عشق میں گرفتار کرا دیتی ہے اور دوسروں کو اپنے عشق میں فراخ دلی سے شریک کر کے وہ غالب کے اس شعر کی تصویر وتفسیر بن جاتی ہیں۔

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش، پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محو ماہِ کنعاں ہو گئیں

اب کے آفتاب اقبال بانو کی سیلانی طبیعت کے عشق کا یہ پڑاؤ ملائشیا ہے، مہاتیر محمد کا ملائشیا، زمردین و اخضریں سرزمیں والا ملائشیا، خوبصورت پھولوں، گنگناتے دریاؤں، زندگی بخش چشموں، دور تک پھیلے جنگلوں، قدرتی آبشاروں اور قدیم داستانیں سناتے پہاڑوں کا مسکن ملائشیا جو یقیناً سیاحوں کا دل موہ لیتا ہوگا لیکن جب اس ملائشیا کی تصویر آفتاب اقبال بانو اپنے قلم کو موقلم بنا کر کاغذ کے کینوس پر اتارتی ہے تو بلاشبہ اسے جنت نظیر بنا دیتی ہے اور ہونٹوں پر بے ساختہ یہ شعر مچل جاتا ہے۔

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

سرشاری اور سرمستی میں اس سفر کی کہانی سناتے ہوئے آفتاب اقبال بانو انسانی جذبات واحساسات سے بھی غافل نہیں رہتی اور اچانک کوئی ایسی بات چھیڑ دیتی ہے

کہ کہانی سننے اور پڑھنے والا آنکھیں بند کر کے کسی اور دنیا میں ٹرانسپورٹ ہو جاتا ہے اور آنکھیں کھلی ہوں تو شکیب جلالی کا ہم زبان بن جاتا ہے

کب سے ہیں ایک حرف پہ نظریں جمی ہوئی
وہ پڑھ رہا ہوں جو نہیں لکھا کتاب میں

یوں تو کئی ایسے مقامات کی تفصیل پڑھتے ہوئے ذہن چند ثانیوں کے لئے ادھر ادھر بھٹک بھی جاتا ہے جیسے دشوار گزار پہاڑوں اور خطرناک ڈھلوانوں پر صرف ڈیڑھ سال میں مکمل ہونے والے کیبل کار کے عظیم منصوبہ کے ذکر سے خواہی نخواہی ذہن پی آر ٹی پشاور کی طرف منتقل ہو جاتا ہے مگر فوراً ذہن جھٹکنا پڑتا ہے کیونکہ دلکش اور دلنشیں سفر کہانی کی کشش فوراً واپس اپنی گرفت میں لے لیتی ہے، تاہم ایسی باتیں بھی آپ کو روک روک لیتی ہیں، جن سے آپ کے سانس چھوٹے ہونے شروع ہو جاتے ہیں اور آپ کو اپنے اعصاب سہلانے کے لئے سفر کہانی سے انگلی چھڑانا پڑتی ہے جیسے بظاہر ایک سیدھی سادی مگر کہیں دل کے بہت اندر سے نکلی ہوئی بات نے مجھے ایسا چپ کرا دیا کہ میں پھر اُس نشست میں سفر کہانی آگے نہ پڑھ سکا، اور کتنی ہی دیر تک اپنے اندر ایسے سانحات ٹٹولتا رہا جن کی وجہ سے آنکھوں میں دھواں بھرتا رہا اور حلق نمکیں ہوتا رہا۔ یہ ذکر ہے کوالالمپور میں آفتاب اقبال بانو کی اس دلی خواہش کا جس کا اظہار انہوں نے اپنے گائیڈ سے کیا اور جس نے اس کی حامی بھی بھر لی تھی، یہ خواہش اپنی ٹیچر مائل کورے اور کورس میٹ سے ملنے کی تھی ”لیکن افسوس میں اپنے دونوں ساتھیوں سے ملاقات نہیں کر سکی، اور شاید (اب) زندگی بھر ایسا نہیں ہو سکے گا۔ کیونکہ ان سے ملنے کا یہ واحد موقع تھا، جس کو یقیناً میں کھو چکی تھی“۔

بس یہ پڑھتے ہی دل بھر آیا تھا یہ تصور کتنا خوفناک ہے جب اپنے پیاروں سے ایک اور ملاقات کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں، مصطفیٰ زیدی نے اپنی خوبصورت نظم ''آخری بار ملو'' میں کہا ہے نا

اُس ملاقات کا اس بار کوئی وہم نہیں
جس سے اک اور ملاقات کی صورت نکلے

ویسے بھی کچھ خواب ایسے ہوتے ہیں جنہیں بار دیگر نہیں دیکھا جا سکتا ان کے ٹوٹنے کا قلق آخری سانس تک رہتا ہے، چہ جائیکہ وہ خواب آخری عمر کے عشق کی دین ہوں یا پھر یہ ان سیلانیوں کی اضطراری اور آفتابی طبیعت کی کوکھ سے جنم لینے والے خواب ہوں اور یوں بھی جن سیلانیوں کے پاؤں میں آفتاب اقبال بانو کی طرح چکر کی بجائے بھنور بندھے ہوتے ہیں اور انہیں نئی زمینیں دریافت کرنے کی للک ہوتی ہے وہ پرانے خوابوں کے کھونٹے سے بندھے نہیں رہ سکتے انہیں مسلسل ان دیکھے جزیرے اپنی اور کھینچ رہے ہوتے ہیں، اور سیاحت کے خوگر ایسے ہی مسافروں کے بارے میں سیف الدین سیف نے کہا ہے

فضائے کنجِ چمن میں ہمیں تلاش نہ کر
مسافروں کے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں

2020 کے جون کی پانچویں صبح

ملائشیا

مصنفہ آفتاب اقبال بانو

انبساط وملال کی تصویریں

شاعری کو شاید اِس لیے جادُو کی بیٹی کہا جاتا ہے کہ شاعر لفظوں کی بنی ہوئی زنبیل سے معانی کے نِت نئے عجوبے نکالتا ہے اور سننے، پڑھنے والے کو سوچ اور فکر کی ایک نئی دُنیا میں ٹرانسپورٹ کر دیتا ہے۔ حیرانی اِس کھیل میں مرکزی کردار ادا کرتی ہے، یہ حیرانی ہی ہے جو ایک طرف پڑھنے والے کو اپنا اَسیر بنا کر چپ کرا دیتی ہے تو دُوسری طرف یہ شاعر کو اپنی ایک جھلک دِکھلا کر کچھ کہنے کی تحریک بھی دیتی ہے۔ ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی کائنات میں سے اپنے حصّے کے دُکھ سکھ تلاش کر کے اُنھیں فکر کی سان چڑھانا ایک اَدق مشق ہے۔ اِس لیے بہت کم لوگ یہ روگ پالتے ہیں اور جِن چنے ہوئے لوگوں کو تخلیق کا یہ مست واَلست گھوڑا اپنے اَیال میں گدگدی کی اجازت دے دیتا ہے اُن میں بیشتر چند قدم چل کر ہلکان ہو جاتے ہیں اور کم کم ہنر کار لمبی ریس کا جگرا رکھتے ہیں سو اُن کی ریاضت سپھل ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر عمر قیاز قائلؔ اُن تازہ کار تخلیق کاروں میں سے ایک طرح دار شاعر ہے، جِس کے سامنے ابھی ایک طویل سفر ہے مگر، جِس اعتماد، حوصلے اور پوری تخلیقی قوت کے ساتھ اُس نے پہلا قدم اُٹھایا ہے اِس سے اَندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ وہ لمبی ریس کا جگرا رکھتا ہے، میں یہ بات اگر وثُوق سے کہتا ہوں تو اِس کی وجہ یہ ہے کہ میں جانتا ہوں کہ

وہ مادری زبان پشتو میں بھی شعر بُنتا ہے۔

ہر چند شاعری اپنے لیے زبان خود چنتی ہے مگر پھر بھی مادری زبان میں شعر کہنے میں سو طرح کی سہولتیں حاصل ہوتی ہیں اور اگر ڈاکٹر عمر قیاز قائلؔ نے اپنے فکری، جذباتی، جمالیاتی اور محسوساتی انبساط و ملال کی وارداتوں کی کہانی سُنانے کے لیے اُردو زبان کو منتخب کیا ہے تو سوبار سوچا ہوگا اور چونکہ بنوں سے اُٹھنے والی ایک معتبر آواز مقبول عامرؔ نے اُردو دُنیا میں اپنے شعر سے ایک بھرپور پہچان بنائی ہوئی ہے سو بعد میں آنے والوں کے لیے جہاں یہ بات تفاخر کی ہے وہاں ایک چیلنج بھی بن جاتی ہے۔

ڈاکٹر عمر قیاز قائلؔ کی ابھی سفر کی شُروعات ہیں مگر اُس کے شعر کے تیکھے تیور ابھی سے اُس کی کامیابی کی علامت بنتے جا رہے ہیں:

پالکی لے کے خیالات کے شہزادوں کی
خیریت پوچھنے نکلا ہوں وفازادوں کی
آج رہ رہ کے کئی لوگ مجھے یاد آئے
گویا اِک شام سجی گھر میں مرے، یادوں کی

ڈاکٹر عمر قیاز قائلؔ کا شعر اَدبی روایت کے تسلسل میں اپنے آج کی حسیات سے جڑا ہوا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آج کے نئے شعر کے آہنگ میں کچھ ایسی آوازیں بھی اپنی پہچان بنا رہی ہیں، جو تجربہ کے نام پر لفظوں کی شُعبدہ بازی سے اپنا دامن بچائے ہوئے ہیں اور میں پوری ذِمہ داری سے کہتا ہوں کہ عمر قیاز قائلؔ کے لہجے کا کھرا پن روایت کی پاسداری اور جدید حِسّیات سے مملو اجتماعی شعور سے جڑے رہنے کی کوشش اُس کے شعری ذخیرہ کو ثروت مند بنا دے گی۔

اُس نے اپنے شعر میں جن رویوں کو تصویر کیا ہے اِن تصویروں نے مجھے دیر تک اپنے سحر میں رکھا:

کیوں کروں اُس کے بچھڑنے کی شکایت قائل
وہ مرے ساتھ رہا تھا تو رہا تھا کتنا

تو مرے ظرف کی تعریف نہ کر اے ہمدم!
یہ سر کوہ ترچ میر نشاں میرے ہیں

میں جو اِس بار ہواؤں کی حمایت کرتا
کون جلتی ہوئی شمعوں کی حفاظت کرتا

کل کے عمر کے برعکس آج کے عمر کی زنبیل میں ایسے اُجلے اشعار کی کمی نہیں جن کو پڑھ کر یقین آجاتا ہے کہ عمر قیاز قائل اگر یہ کہتا ہے کہ ''محبت عام کرنا چاہتا ہوں'' تو ٹھیک کہتا ہے۔ آیئے اُس کے اِس تجربے کی چھاؤں میں انبساط و اَلم کی کچھ گھڑیاں ہم بھی بِتائیں۔۔۔

محبت عام کرنا چاہتا ہوں
شاعر: عمر قیاز قائل

شہر۔شام۔اور۔۔اچھوینی

ہمارے محلّہ اور بازار کے اتصال پر ایک دودھ والے کی دکان تھی جس کے پاس ہی زمین پر صبح سویرے ایک حلوے والا بیٹھتا تھا۔ مجھے اس کے اصل نام کا تو علم نہیں لیکن سب اسے ''کھاتا پیتا'' کہتے تھے، وہ خود تو جانے کیا کھاتا پیتا ہوگا مگر اس کا بنایا ہوا ہلکی گلابی رنگت والا حلوہ جو ایک بار بھی چکھ لیتا وہ سارا دن دوسری صبح کا انتظار کرتا تاکہ دوبارہ حلوہ کھا سکے، اس کا تھال دوڈھائی گھنٹوں میں ختم ہو جاتا لیکن حلوہ کا ذائقہ کبھی ختم نہ ہوتا، کھاتا پیتا کے اس حلوہ کے علاوہ جو حلوہ میرے حافظہ میں موجود ہے اور جب بھی اس کے بارے میں سوچتا ہوں زبان پر اس حلوہ کا ذائقہ محسوس کرنے لگتا ہوں تو ساتھ ہی آنکھوں میں دھواں پھیلنے لگتا ہے اور پھر جیسے سارا کمرہ ماں کے مہربان چہرے سے بھر جاتا ہے، ماں کے ہاتھ کے بنے ہوئے حلوہ کی وہ قسم اچھوینی کہلاتی ہے یہ حلوہ کھایا نہیں پیا جاتا تھا۔ اچھوینی بنتی تو خاص مواقع پر تھی مگر محبتیں تو موسموں کی قید سے آزاد ہوتی ہیں اس لئے میری فرمائش پر کسی بھی دن کسی بھی وقت ماں بنا دیا کرتی تھی۔ بہت دنوں بعد گزشتہ شب میرا کمرہ ماں کے مہربان چہرے سے اس وقت بھر گیا تھا جب میں نصرت نسیم کی خودنوشت کے اس باب پر پہنچا جس میں اچانک ہی اچھوینی کا ذکر آ گیا، سردی کا یہی توڑ ہے میں پھر کتنی ہی دیر ماں کے مہرباں چہرے

میں کھویا رہا، اس خودنوشت میں نصرت نسیم کی یادیں بھی انہی گلی گلیاروں میں کھیلتی ہوئی آگے بڑھتی ہیں جو کسی کھلنڈرے ہمزاد کی طرح میری تنہائیوں میں بھی دھمال ڈالنے لگتی ہیں، ذرا سے فرق سے ان کہانیوں کا لوکیل ایک ہے، ویسے تو سارے پرانے شہر ایک طرح کا مزاج رکھتے ہیں مگر پشاور کی طرحداری چیزے دیگر است۔ کوہاٹ میرا دیکھا بھالا شہر ہے اور چونکہ میری بیگم رفعت علی سید کی خالہ کا وہاں گھر ہے تو ان کے ہاں کئی ایک شادیوں میں جا کر میں نے جو رسومات دیکھیں یا لڑکیوں بالیوں کی شوخیاں اور قہقہے سنے وہ میری یادداشت میں اب بھی محفوظ ہیں مگر یہ میری شادی کی پہلی پہلی سرشاریوں کا زمانہ تھا اس لئے ان کی یادیں آنکھوں میں نمی کی بجائے ہونٹوں پر دھیمی دھیمی مسکراہٹ کو جگا دیتی ہیں مگر اب جو میں نے نصرت نسیم کی دل کو کہیں بہت اندر سے چھونے والی کتھا کے کینوس پر کوہاٹ کا چہرہ دیکھنا شروع کیا تو بہت حیرانی ہوئی انہوں نے یہ تو بہت درست لکھا ہے کہ پشاور اور کوہاٹ کے رہن سہن اور کلچر میں زمین آسمان کا فرق ہے مگر میری حیرانی کی وجہ یہ ہے کہ کوہاٹ اور اکوڑہ خٹک کے باسیوں کے شب و روز، شادی بیاہ اور تہواروں کے ہنگاموں میں ذرّہ برابر فرق نہیں ہے اس سے مجھے لگا کہ برصغیر کے شہروں اور قصبات کے طور طریقے کسی زمانے میں کم و بیش ایک سے رہے ہوں گے مگر پھر شہر نے پرائی تہذیبوں کو جگہ دینے کی ٹھان کر اپنے رستے دیہاتوں سے الگ کر لئے، اور بنارس کے شاعر ''دھومل'' کو اپنی نظم ''شہر، شام اور بوڑھا'' کے آخر میں کہنا پڑا کہ

اب شام ہے۔۔اور'
شہر اپنے جنوں کو آہستہ آہستہ شیشے اور روشنی میں بدلنے لگا ہے'

'اسی شیشہ اور روشنی کی چکا چوند نے شہر کی زندگی کو سولہ سنگار کا خوگر بنا لیا جس کی وجہ سے وہ فطری اور بے ساختہ حسن کہیں دب کر رہ گیا مگر دیہات، قصبات بننے تک اپنے خدوخال کو بڑی دیر تک سنبھالے رہے اُس وقت کا کوہاٹ ہو اکوڑہ خٹک ہو یا شہروں سے فاصلے پر رہنے والی اس طرح کی کچھ اور بستیاں ان کے باسی شہروں کی اور جاتے تو ضرور تھے مگر شام سے پہلے پہلے لوٹ آتے تھے، وہ جانتے تھے کہ شہر کا جنوں شام کے وقت شیشہ اور روشنی میں خود کو ڈھالنے لگتا ہے اس لئے وہ منظر شب تاب کے سحر سے بچنے کے لئے شہر سے لوٹ آتے تھے، مگر میری طرح کے کتنے ہی ایسے دیہاتی بھی تھے جن سے گاؤں کو جانے والی آخری بس چھوٹ جاتی ہے اور وہ شہر کی مرلی بجاتی گنگناتی شام کی زلفوں کے اسیر ہو جاتے ہیں۔ شاید اسی لئے کبھی میں نے کہا تھا کہ

کچھ شہر کی شاموں میں بھی اک سحر تھا ناصرؔ
کچھ گاؤں کی صبحوں نے بھی ہم کو نہ پکارا

اور جو دل کی بات کہوں تو ان شہروں کی ساری رونقوں اور ہنگاموں کو گاؤں سے شہروں کی طرف آنے والوں نے ہی آباد رکھا ہوا ہے۔ تاہم شہروں میں بسنے والے بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جنہوں نے نصرت نسیم کی طرح اپنی یادوں کو نہ صرف سنبھال کر رکھا ہے اور جو بہانے بہانے انہیں خوبصورت، اور اور دل کو موہ لینے والے لفظوں سے ترتیب دی ہوئی دلنشین تحریر سے صیقل بھی کرتی رہتی ہیں، تحریر کو متحرک تصویر بنانے کا جو ملکہ مالک کی طرف سے انہیں ودیعت ہوا ہے وہ بہت سوں کو رشک کے احساس سے مضطرب اور مغلوب رکھتا ہے۔ گزشتہ کل کی یادوں کے آس پاس ہی کہیں آنسوؤں کی

دھند بھی رہتی ہے لیکن جب ان یادوں کی راوی معجز نگار قلمکار نصرت نسیم ہو تو آنکھوں میں پھاگن نہیں بھادوں کی جھڑی بسیرا کر لیتی ہے جس کے بارے میں ابنِ انشا نے کہا تھا ''برسے تو بڑی برسے'' آخری بات کہ نصرت نسیم کی اِن یادوں کو پڑھنے کے لئے 'کھاتا پیتا' کا حلوہ تو خیر اب ممکن نہیں ہو گا مگر کسی سے اخروٹوں بادا موں والی اچھوینی بنا کر ''نیم کاسہ'' میں ڈال کر چسکیاں بھرنے سے اس خود نوشت کا مزہ دو آتشہ ہو جائے گا۔۔۔رفعت۔۔رفعت۔۔رفعت یار تمہیں اچھوینی بنانا آتی ہے۔۔۔

2021 کے آخری مہینے کی 8ویں صبح

بیتے ہوئے کچھ دن ایسے ہیں

مصنفہ: نصرت نسیم

بس ایک آخری قصّہ سنا کے اُٹھتا ہوں

اگر ٹیگور کا خیال درست مان لیا جائے کہ شاعری نوزائیدہ بچے کی وہ چیخ ہے جو کائنات کی اس بات کے جواب میں ہوتی ہے، کہ میں موجود ہوں گویا نوزائیدہ بچے کی چیخ بھی اپنے ہونے کا اعلان ہے، اور یہی اعلان شاعری بھی کرتی ہے یا اسے کرنا چاہئے، مگر شاعری کو اپنے ہونے کے اعلان کرنے تک بہت صبر آزما مراحل سے گزرنا ہوتا ہے، شاعری کی یہ احتیاط ہی دراصل اسے اعتبار دلاتی ہے، اور جو شعر، اس احتیاط سے جتنے فاصلے پر ہوگا اس شعر کی اثر پذیری اتنی ہی سطحی ہوگی، کچھ ایسا ہی سلسلہ ان دنوں شعر کے ساتھ چل پڑا ہے کہ چند ایک معتبر اور توانا آوازوں کو چھوڑ کر بیشتر تخلیق کاروں کا سارا زورِ بیاں لفظوں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے، اس لئے آج کا شعر بھی اپنا آپ عمومی سماعتوں تک پہنچا کر اور ان سننے والوں کی وقتی حیرانی بھری خوشی کو اپنا حاصل سمجھ کر اتراتا پھرتا ہے، مگر دل میں مستقل جگہ نہ بنانے کی وجہ سے جلد ہی بھلا دیا جاتا ہے، یہ مقبول شاعری کا المیہ ہے کہ بسا اوقات وہ اپنے شاعر کو گمراہ کر دیتی ہے اور اسے ان موضوعات اور لفظیات کا اسیر بنا دیتی ہے جس نے کاغذ پر اتر کر کتاب میں شامل ہو کر کسی دل کو اپنا طرف دار نہیں بنانا ہوتا، تو یہ جو اطراف سے نئے شعر پر تحفظات کا اظہار کیا جا رہا ہے اس کی وجہ غالباً شعر کی اثر پذیری میں کمی ہے، ٹیگور ہی نے کہا تھا کہ شاعر

تو محض سروں کے مزے لیتا ہے میں اس بات کے حوالے سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ شاعر صرف خود سروں کے مزے نہیں لیتا، پڑھنے والے کو بھی غیر محسوس طریقے سے اس لطف اور اپنے اس تجربے میں شریک کر لیتا ہے، اور اسی سے شعر میں معانی پیدا ہوتے ہیں، وہ معانی جو شعر کو کبھی پرانا نہیں ہونے دیتے، میں تواتر سے نئی شاعری کا صرف قاری ہی نہیں دلدادہ بھی ہوں، لیکن بیشتر اشعار کچھ دور چل کر انگلی چھڑا لیتے ہیں، غزل کے بارے میں جتنا کچھ بھی کہا گیا ہے یا کہا جا رہا ہے اس کی وجہ اس طرحدار صنف کی سخت جانی یا ثابت قدمی کے ساتھ ساتھ روایت کے ساتھ جڑے رہنے اور اساتذہ کے بنائے ہوئے اصول وضوابط کی پاسداری اور وہ کمٹمنٹ ہے جس کی بناء پر اس کی ہیئت نے ''تا قیامت تازہ مضامین کے لئے بابِ سخن کھلا رکھا ہوا ہے۔'' مگر کچھ نئے شاعر ان اصول وضوابط کو قصّہ پارینہ گردانتے ہوئے ان سے صرفِ نظر کرنے کو آج کے دور کی ضرورت سمجھتے ہیں، ایسے شاعر تعداد میں کم سہی یہاں وہاں فعال زیادہ ہیں، اور کچھ مبہم جو ان کو یقین بھی دلا رہے ہیں کہ نہ ہوئے غالبؔ اس دور میں ورنہ ''بے استاذے'' نہ کہلاتے۔ لیکن اسی دور میں ان نئے باکمال شاعروں کی بھی کمی نہیں جنہیں شعر گوئی کا ایسا ملکہ ودیعت ہوا ہے کہ یکبارگی ان کے حق میں زبان سے ماشااللہ اور چشم بد دور کی دعا نکلتی ہے۔ اور ایسے باکمال شعرا میں جنید آزر بھی شامل ہیں، بہت دن تک کشف کا مسودہ میری میز پر پڑا رہا، ایک ان جانا سا خوف مجھے اسے کھولنے سے روکتا رہا، شاید وہی خوف تھا جس کا ذکر کر چکا ہوں پھر ایک دن ایسے ہی کشف کا ورق الٹا اور جیسے بے خیالی میں غزل پڑھنے لگا۔ مطلع ہی نے روک لیا۔۔۔۔

اُٹھ کوچہ خمار سے رختِ سفر اٹھا
اے یادِ یار زانوے حسرت سے سر اٹھا

اور میں سنبھل کر بیٹھ گیا، مجھے جواں فکر جنید آزر کے تیور بھا گئے۔ یہ لب و لہجہ اور طرز کلام اپنے اندر جو پختگی لئے ہوئے تھا وہی تو غزل کا مزاج ہے، وہ مزاج جس نے غزل کو ہر دور کی ضرورت بنایا ہوا ہے، میں نے خود سے پوچھا، تو کیا مست والست رخشِ غزل نے جنید آزر کو اپنے ایالوں میں گدگدی کی اجازت دے دی ہے، اس سوال کے جواب کے لئے مجھے دور نہیں جانا پڑا کہ اسی غزل کے اشعار یکے بعد دیگرے سر اٹھا اٹھا کر مجھے اپنا طرفدار بنانے لگے

یہ کیا کہ روز و شب ترے در پر پڑے رہیں
اے دل گزیدہ شام قبائے سحر اٹھا
رکھ دھیان! زخمِ جاں میں خیانت نہ ہو کہیں
کاندھے پہ بارِ عشق ذرا سوچ کر اٹھا
لے چل بدن کا شور ہَوا میں سمیٹ کر
بکھرے ہوئے سکوت میں لہجے سے ڈر اٹھا

ان دنوں ایسی آراستہ غزلیں کم کم پڑھنے، سننے میں آتی ہیں، کیونکہ اب جو شعر رواج پا رہا ہے اس میں ہجر و صال کے قصے ہوں یا غم روزگار کے حوالے گزشتہ کل کی نسبت ذرا اور طرح سے برتے جا رہے ہیں، پھر غزل کے روایتی محبوب کو اختر شیرانی سے بھی دو ہاتھ آگے بڑھ کے جس لب و لہجے میں مخاطب کیا جا رہا ہے، وہ آج مشاعرہ کے سامعین کے لئے قابل قبول ہی نہیں قابل داد بھی ٹھہرتا ہے، یوں بھی زیادہ تر

مشاعرے ان دنوں کالج اور یونیورسٹی میں ہوتے ہیں، جس کی خاطر شاعر کو شعر کہنے اور سننے کے لئے ''کچھ زیادہ'' کرنا پڑتا ہے خیر ان کی وہ جانیں، مگر مجھے حیرت ہوئی کہ جنید آزر نے گردوپیش کی اس ''مشاعراتی فضا'' سے ذرا بھی اثر نہ لیا اور اپنے شعر کو ''شاعری'' کی اطراف میں رکھتے ہوئے اپنے خوابوں کو شعر کے ماتھے کی جھلملاتی بندیا میں ڈھال دیا، شاعر خواب گر ہوتا ہے مگر جنید آزر جب ایک تجاہل عارفانہ سے یہ کہتا ہے

جب ایک پل کو مجھے نیند ہی نہیں آتی
تو خواب آنکھ میں شب بھر کہاں سے آتے ہیں

تو اس استفسار کا سیدھا سادا سا جواب یہ ہے کہ یہ خواب آنکھوں میں کہیں سے بھی آتے جاتے نہیں، وہیں مستقل بسیرا کئے ہوئے ہیں، اور جن آنکھوں میں خواب بستے ہوں وہ سیر چشم ہی یہ کہنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

مدت سے میں خوابوں کی قناعت پہ ہوں زندہ
رہتا ہے لہو میں مرے ہیجان بہت کم

کشف کا شاعر ''خوابوں کو خواب کی تعبیر سے پہچانتا ہے'' اس لئے اس کے شعر میں شام وسحر سے زیادہ راتوں کا ذکر ہے اور ان راتوں میں وہ خواب دیکھتا نہیں انہیں برتتے ہوئے ان 'خوابوں کی تجرید کو زندہ' رکھتا ہے، یہ تجرید اس کے تخیل میں جب رچ بس جاتی ہے تو پھر ایسے شعر وجود میں آتے ہیں۔

اتنی شدت سے میں نے پکارا اسے
میری آواز پر آبلہ رہ گیا

اک دن کسی رخنے میں پڑی رہ گئیں آنکھیں
اس دن سے ہی دیوار کو در بول رہا ہوں

جنیدآذر کولفظوں سے جوزندہ تصویریں بنانے کا ہنرودیعت ہوا ہے وہ اسے کسی غیرحقیقی یا سطحی قسم کی جذبایت سے کوسوں پرے رکھتا ہے، اس کی بنائی ہوئی یہ شعری من موہنی تصویریں ''کشف'' کونگارخانہ بنائے ہوئے ہیں،

مرے منظر سے کتنے اور منظر پھوٹتے ہیں
کرن ہوں، روشنی ہوں اور نگینوں میں پڑا ہوں
جھڑے گی روشنی جب ہر شجر کی پوروں سے
مرے اُجڑنے کا منظر وہاں سے جھانکے گا
پہلے بھی کسی آنکھ میں، میں دیکھ چکا ہوں
یہ رنگ بہت بعد میں الماس پہ آیا

میری بات طول کھینچ گئی اور مجھے خدشہ ہے کہ اس طرح تو کشف کی ساری تصویریں میری بات میں آجائیں گی، کیا کروں ''لذیذ بود حکایت درازتر گفتم''، میں تو ہر بار خود سے یہ کہتا ہی رہ گیا۔۔۔

ذرا رکو! کہ ابھی سننے والے سنتے ہیں
بس ایک آخری قصہ سنا کے اٹھتا ہوں

کشف

شاعر: جنیدآزر

خالد! تو بہت بے درد ہے

رات گئے جب خاموشی کے سانس لینے کی آوازیں، دبے پاؤں آنے والی اداسی کی چاپ میں مدغم ہونے لگتی ہیں تو تنہائی میں سلگنے والے دل جانتے ہیں کہ اب جادوئی آواز والے سی ایچ آتما کو اپنی محفل میں بلانے کا وقت ہے۔ خود میں نے ان کی صحبت میں جتنا سمے بتایا ہے کمال لطف اٹھایا ہے، میں آنکھیں بند کر کے ان کی آواز کے زیر و بم سے شرابور ہوتا رہتا ہوں اور پھر کلام کا انتخاب بھی ایسا کہ لفظ لفظ سے بنتی شباہتیں جیسے میرے کمرے میں سانس لیتا ہوا مانی کا نگار خانہ وجود میں لے آتی ہیں۔ وہ وقت عجب بے خبری اور خود فراموشی کا ہوتا ہے، جب میں اپنا آپ سی ایچ آتما کی آواز اور اس کے مدھم سروں میں چھوئے ہوئے لفظوں کے سپرد کر دیتا ہوں، تب مجھے لگتا ہے جیسے میں صرف سن نہیں رہا ہوتا ہوں بلکہ مجھے اپنا آپ کسی سمندر کے کنارے روتا ہوا بھی محسوس ہونے لگتا ہے اور اُدھر دل پر گزرنے والی ہر واردات سے بے خبر کٹھور سمندر میری ہنسی اڑا رہا ہوتا ہے۔۔۔۔روؤں میں ساگر کے کنارے۔ساگر ہنسی اڑائے۔۔ میرے کانوں میں مسلسل سی ایچ آتما کی آواز دھمال ڈال رہی ہوتی ہے۔ مگر ایک دن اسی کیفیت میں مجھے بے خبر کٹھور سمندر اچانک پیاس سے بلکتا اور بپھرا ہوا نظر آنے لگا، ایک ایسا سمندر میرے چاروں طرف پھیل گیا جسے شدت سے

مون سون کی رم جھم کا انتظار تھا تا کہ ''آ کاش کے جل سے اپنے جل کی پیاس بجھائے''، میرے لئے یہ تصور پکاسو کی کسی پینٹنگز سے بہت مشابہت رکھتا تھا، پکاسو جو میری خلوتوں کو اکثر بہت بامعنی بنادیا کرتا ہے،،سو میں اس کی طرف کھنچتا چلا گیا۔اب منظر کھل گیا تھا۔لیکن پھر بہت قریب سے آتی ہوئی سی ایچ آتما کی آواز نے میرے کانوں میں ایک نیا راگ الاپنا شروع کر دیا تھا۔''شریا اور آتما کا میل ٹوٹا نہیں ہے۔نہیں ٹوٹے گا۔۔کبھی نہیں'' میں نے اس نئے راگ کو سمجھنے کے لئے جب سر کو جھٹکا تو کانوں میں پیاسے سمندر کی کرلاتی ہوئی صداؤں کے سنگ ایک اور آواز بھی سنائی دینے لگی''نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔مون سون ہمارے لئے شادمانی لے کر آئے گا'' میں نے پریشان ہو کر آنکھیں کھولنا چاہیں تو معلوم ہوا کہ آنکھیں تو پہلے سے کھلی ہیں،البتہ لیپ ٹاپ کے خودکار سسٹم پر اب سی ایچ آتما کی آواز کی بجائے وائلن پر ''کہیں دور جب دن ڈھل جائے'' کی دھن پلے ہو رہی تھی اور میں مون سون کے میلے سے پہلے کی آخری شام سمندر کنارے بیٹھے دو کرداروں کی گرفت میں تھا، میں سوچنے لگا کیا ان کرداروں کی بظاہر اس سادہ اور گھریلو قسم گفتگو میں اتنا دم ہے کہ سی ایچ آتما کی جادوئی آواز سے میری برسوں کی دوستی میں دراڑ ڈال کر مجھے اپنا اسیر کر لیا، جب میں یہ جاننے کے لئے ان کرداروں کی طرف متوجہ ہو رہا تھا تو بس اتنا یاد ہے کہ اس وقت وائلن پر''پل پل دل کے پاس تم رہتے ہو۔۔'' کی دھن پلے ہو رہی تھی مگر اس کے بعد پتا ہی نہیں چلا کب اور کیسے میں، مون سون کے میلے سے پہلے کی اس آخری شام ان کرداروں کے پاس جا بیٹھا، جن کی لاؤنڈ تھنکنگ ، میں اور سمندر دونوں سن رہے تھے''۔کل مون سون لگ جائے گا۔اور ایشور اپنی کرپا سے چاکرا کے سمندر کو

مچھی اور جھینگے سے بھر دے گا۔ ہمارے جیون کی ڈور تو اسی سے بندھی ہوئی ہے۔" اب معلوم ہوا کہ سماعتوں کے بیاباں میں موسیقی کے کھلائے ہوئے پھولوں پر کہانی کی شبنم قطرہ قطرہ اپنا طلسم پھونک رہی ہے۔ اور طلسم بھی ایسا کہ مجھے کہانی اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ سنائی ہی نہیں دکھائی بھی دے رہی ہے، کیسی وائلن اور کون سی اپچ آ تما۔ مجھے تو یوں لگ رہا تھا جیسے میں اب کہانی کے ساتھ ساتھ بہتا چلا جا رہا ہوں،، مجھے مون سون کے میلے سے ایک شام پہلے سمندر کنارے بیٹھے وہ دو کردار جانے کیوں الہ آباد میں دو دریاؤں گنگا جمنا کا وہ سنگم لگے جہاں بارہ سال کے بعد کمبھ کا میلہ لگتا ہے، مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ سنگم دراصل تین دریاؤں کا سنگم ہے گنگا جمنا اور تیسرا دریا سرسوتی ہے جو دکھائی نہیں دیتا۔ چکرا سمندر کے کنارے بیٹھے یہ دو کردار بھی دراصل تین کردار ہیں تیسرا کردار ابھی ماں کے پیٹ میں ہے اور سرسوتی کی طرح نظر نہیں آتا، اس سوچ کے آتے ہی ایک سوال میرے اندر سے اٹھا کیا یہ تیسرا کردار اس بے کراں سمندر کو دیکھنے کے لئے جنم لے پائے گا یا۔۔۔لیکن ۔۔ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا، ابھی کسی کو بھی اس منظر سے آگے دیکھنے کی اجازت نہیں ہے، کہانی کوئی سنے یا دیکھے، دیکھنے اور سننے والے کی اپنی ایک حد ہوتی ہے کیونکہ ہر کہانی کے اپنے سو پردے ہوتے ہیں اور کونسا پردہ کب اٹھانا یا کب گرانا ہے یہ ساری گیم، کہانی بننے والا اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے، اور پھر اس کہانی کا تو بننے والا خالد سہیل ملک ہے، ایک طرح دار قصّہ گو ایک مشّاق کہانی کار، اک عمر کی ریاضت کا حامل افسانہ نگار اور ایک مصور جو موقلم سے ایسے ہوشربا منظر تخلیق کرنے پر قدرت رکھتا ہے جن مناظر کی کلر سکیم کہانی پڑھنے والے کی آنکھیں اپنے پاس رہن رکھ لیتی ہے، اس لئے پڑھنے والے کو بس اتنا

ہی دیکھنا ہوتا ہے جتنی دیکھنے کی اجازت اسے خالد سہیل ملک دیتا ہے۔ سو اس وقت میری آنکھوں میں کھلا سمندر تھا جس کے کنارے بیٹھے اور آنے والے کل کے مون سون میلے سے امیدیں باندھنے والے دونوں کردار آہستہ آہستہ سارے منظر پر چھا رہے تھے، سمندر اب پس منظر میں تھا اور وہ دونوں کردار سمندر سے بڑے ہو رہے تھے۔ وہی دو کردار جو دراصل تین تھے اور جوں جوں بے کراں سمندر سمٹتا جا رہا تھا، میری دلچسپی فربہ ہوتے ہوئے دونوں کرداروں سے بھی بڑی ہوتی جا رہی تھی پھر میں جیسے ہپناٹائزڈ سا ہو کر ان سے جڑ گیا تھا، حتیٰ کہ ان کرداروں کے ساتھ ان کی کٹیا میں ایک بے چین رات گزار کر مون سون کے میلے کی صبح بھی میں ان سے الگ نہ ہو سکا۔ میں اس وقت بھی اُس کردار کے آس پاس تھا، جب وہ مچھلی کے لئے سمندر میں ڈالا گیا جال پانی سے باہر کھینچ رہا تھا، لیکن پھر

''جال پانی سے باہر آیا تو وہ بری طرح پھٹ چکا تھا۔ جب پھٹے ہوئے جال کو، اپنے کندھے پہ اٹھائے وہ کٹیا کی طرف بڑھ رہا تھا تو وہ یہ جان چکا تھا کہ اس کا ستارہ گردش میں آ چکا ہے۔ وہ خود کو اعصابی طور پر کسی بری خبر کے لیے تیار کر رہا تھا۔ کٹیا سے کچھ دور ہی شو بھا نے اسے یہ کہہ کر کٹیا سے باہر ہی روک لیا تھا کیونکہ ''اندر سیتا موسی ہے۔''

مجھے بھی اس کردار کے ساتھ باہر ہی رکنا پڑا کیونکہ ''اندر سیتا موسی ہے'' مگر پھر کوئی خبر نہ ملی۔ کیا ہوا۔ اب میں اس مشاق قصّہ گو کی گرفت میں تھا جس نے یہ کردار تخلیق کئے تھے کہانی بنی تھی، چالاک قصّہ گو نے کمال مہارت سے ''اندر سیتا موسی ہے'' کے بعد کا منظر ہی بدل دیا، نہ کوئی بات، نہ خبر، نہ اطلاع اور نہ ہی کوئی سیگنیچر ٹیون مگر سکرپٹ میں جیسے نظر نہ آنے والا ''چینج اوور'' لکھ دیا گیا تھا۔ اور میں اپنے اعصاب سہلانے لگا، وہ

جان لیوا لمحہ کسی طور ٹل گیا۔ میلہ کا ہنگامہ سرد ہوا مون سون لد گیا نیلے آسمان کے نیچے سمندر کنارے کی زندگی پل پل آگے بڑھتے بڑھتے ایک اور مون سون کے میلے سے پہلے کی آخری شام تک جا پہنچی۔ سمندر کنارے پھر ایک خواب کی سرگوشی سنائی دی۔

''کل مون سون لگے گا۔ ہمارے ساحل پر پھر سے میلہ لگے گا۔ مون سون کا میلہ۔ جو تمہارے من کو بہت بھاتا ہے۔ اس بار تو ضرور ناؤ خرید لیں گے۔ اور کٹیا کی مرمت بھی ہو جائے گی بھگوان کی کرپا ہے۔''

''پچھلے ورش بھی تم نے یہی کہا تھا، مگر ہوا وہ جو۔ جو ہم نے نہیں چاہا تھا۔ الٹا جال کا قرضہ چڑھ گیا تھا۔''

پھٹے ہوئے جال سے مجھے بھی یاد آیا کہ پوچھوں ''اندر سیتا موسی ہے'' کے بعد کیا ہوا۔ مگر کہانی سننے والے کو تو دم سادھے کہانی سننا ہوتی ہے اسے بولنے کی اجازت کب ہوتی ہے،، میرا سانس بھی گلے میں اٹکا ہوا تھا کہ سیتا موسی باہر آئی تو اس کے پاس بتانے کو کیا تھا؟، اچانک خالد سہیل ملک نے کہانی کا آخری پردہ گراتے ہوئے مون سون کے میلے سے پہلے کی آخری شام کہانی کے کردار رام اوتار کو پورے ایک سال بعد سیتا موسی کے باہر آنے کی کہانی میں سننے والے کو شریک کرنے کی اجازت دی تو میرے حلق میں رکا سانس جیسے چل پڑا میری آنکھیں بھیگ گئیں اور اعصاب کا تناؤ کم ہوا تو مجھے محسوس ہوا جیسے میں جا کر اسمندر کے کنارے سے بحیرہ روم کے جزیرہ سسلی جا پہنچا اور شہر کے بارونق بازاروں میں برہنہ بھاگتے ہوئے ارشمیدس کا ہم زبان ہو گیا ہوں، یوریکا۔۔۔ یوریکا۔ یوریکا

'اری ناشکری عورت! مون سون ہمیں کیا نہیں دے گیا۔ وہ تو ہمیں ہمارا جیون دے

گیا ہے۔۔جیون۔۔اٹھو، جاؤ اور کٹیا میں سے مون سون کو اٹھا لاؤ۔وہ جاگ چکا ہوگا۔''

الہ آباد کے سنگم پر تریوینی مکمل ہو چکی تھی گنگا جمنا کے سنگ سرسوتی نے خود کو آج آشکارا کر لیا تھا اور پھر اسی مون سون نے مجھے نہ جانے کتنے دن اپنے سحر میں جکڑے رکھا، خالد سہیل ملک کی کہانیاں مجھے پکارتیں تو میں مون سون کی طرف جا نکلتا، مجھے ایک انجانا سا خوف تھا کہ دوسری کہانی کو چھوتے ہی کہیں میرا نشہ نہ ٹوٹ جائے، ادھر سی ایچ آتما بھی مجھے واپس بلا رہا تھا۔''پریتم آن ملو'' پھر وقت آگے بڑھتا رہا میں خالد سہیل ملک کی باقی کہانیوں کو کتابوں اور رسالوں تلے چھپاتے چھپاتے عاجز آ گیا تو ایک دن جی کڑا کر کے خود کو کہانیوں کے سپرد کر دیا، مجھے نشہ ٹوٹنے کا اندیشہ تھا مگر مجھے علم نہ تھا کہ جب ''موسم بدلتا ہے'' تو نشہ دو آتشہ بھی ہو جایا کرتا ہے، اور میں بھی نئی کہانی کے مسحور کن ماحول میں جانے کس اور نکل گیا۔ جہاں لوگ تو تھے مگر میں کسی سے پوچھ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ۔

''وہاں تو ہر کوئی اپنے اپنے کانچ کے گلاسوں میں ڈوب کر اپنی اپنی من پسند دنیاؤں کی سیر پر نکل چکا تھا۔

یہ کہانی سمندر کنارے سے شہر کی پکی سڑک پر آ گئی تھی۔ میں کہانی کہانی آگے بڑھتا اور خالد سہیل ملک کی قصّہ گوئی کی مہارت سے بھیگتا رہا، ہر کہانی اپنی اکائی میں ایک پوری زندگی جی رہی ہے، اور اس زندگی میں کہانی کار اپنے تخیل اور فکر کے بیل بوٹے کھلاتا جاتا ہے، اس کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے اس لئے وہ قدم قدم پر پڑھنے والے کو روک لیتا ہے، 'چاند سے وعدہ' کی حویلی کی زندگی ہو۔

''اس کا بدن اگر چہ تھکن سے چُور چُور تھا مگر نیند نہ جانے کیوں گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کی طرح اس کی آنکھوں سے بہت دور چلی گئی تھی۔''

''بھاڑ میں گیا تمھارا نیا زمانہ۔ارے بیٹا عورت تو زمیں ہے زمین۔جس پر فصل ہر وقت تیار رہنی چاہیے۔''یا''پھر اس سیس ملے کا''ماحول ہو۔

مرد کی آنکھیں تو عورت کو دل کی بات بتا ہی دیتی ہیں۔دل کی بات؟ ہوس بھی تو کہیں دل ہی سے اٹھتی ہوگی نا۔'' ''۔مگر وہ کیا سمجھتی تھی مجھے۔۔اعتبار بھی کتنی کتی چیز ہے۔۔مگر کرنا تو پڑتا ہے نہ زندگی میں کسی نہ کسی پر۔'' ''ماں تو یہیں کہیں ہے۔موجود ہے۔۔مجھے کیوں لگتا ہے کہ وہ ہے۔۔یہیں کہیں۔۔ماں کی خوشبو۔۔پھیلی ہوئی ہے۔۔سارے فلیٹ میں۔۔ماں کی خوشبو۔۔۔عجیب ہے مجھے ماں یاد آرہی ہے۔۔یاد رُلا رہی ہے مجھے۔ماں کی یاد۔ماں جو میری نہیں تھی، گویا ماں ایک احساس ہے۔تبھی تو ماں کو یاد کر رہا ہوں۔یا' تیری گٹھڑی میں لاگا چور' کے جواں دلوں کو گدگداتے اور جذبات میں ہلچل مچاتے منظر''بارش نے اچانک اسے راستے میں دبوچ لیا تھا۔آج ان مانوس راستوں پر چلتے ہوئے اسے یہ احساس ہو رہا تھا جیسے بارش میں گیلے کپڑوں سے باہر بہتے ہوئے اس کے بدن کو ڈھانپنے کے لئے اس کی چادر کم پڑ گئی ہو''،''گیلا یونیفارم تبدیل کر لینے کے بعد اس کے قدم خود بخود ماں کے کمرے کی جانب اُٹھ گئے تھے، جہاں وہ سنگھار میز کے قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر پوری احتیاط کے ساتھ اپنے جسم پر سے اُن آنکھوں کو نوچ نوچ کر اتار سکتی تھی، جنہیں وہ اسکول سے گھر تک کے اس راستے میں اپنے جسم پر چپکا آئی تھی۔''

خالد سہیل ملک نے ہر کہانی کے لئے ایک نیا لوکیل ہی نہیں چنا اس لوکیل میں سانس

لینے والے سارے کرداروں کا رکھ رکھاؤ گفتگو، رویّہ اور ان کا طرز زندگی اسی لوکیل سے مطابقت رکھتا ہے کرداروں کے منہ میں وہ اپنی زبان رکھنے کا قائل نہیں، ہر کردار کو اسی ماحول کی زندگی وہ جینے دیتا ہے جس میں وہ پلا بڑھا ہے۔ میں نے کہا نا خالد سہیل ملک، ایک طرح دار قصّہ گو ایک مشاق کہانی کار، اک عمر کی ریاضت کا حامل افسانہ نگار اور ایک مصور جو موقلم سے ایسے ہوشربا منظر تخلیق کرنے پر قدرت رکھتا ہے جن مناظر کی کلر سکیم کہانی پڑھنے والے کی آنکھیں اپنے پاس رہن رکھ لیتی ہے، خالد سہیل ملک کی کہانی کی یہ کلر سکیم معاشرتی ناہمواریوں، نفسیاتی الجھنوں، پورے ادھورے کچے پکے خوابوں، سانس چھوٹے چھوٹے کرنے والے ناسٹیلجیا اور کچھ ممنوعہ راستوں کے پیچ وخم سے ترتیب پاتی ہے۔

وہ جذبات کی تصویریں بناتے ہوئے احتیاط کی چھتری بند ہی رکھتا ہے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ پڑھنے والا اب ماضی کے برعکس ایک مختلف دنیا کا باسی ہے، اس دنیا کا سارا نظام اب شیشے کے گرد گھومتا ہے شیشہ جسے سکرین کہا جاتا ہے، چھوٹی سے چھوٹی ڈیوائس سے لیکر بڑے سے بڑے سسٹم تک سکرین ہی ہماری صبح و شام اور راتوں کو یرغمال بنائے ہوئے ہے، جس پر کیا کیا کھیل دکھائے اور رچائے جاتے ہیں تو ایسے میں کوئی بھی سچا فنکار احتیاط کی چھتری کھلی نہیں رکھ سکتا۔ خالد سہیل ملک کی ہر کہانی کا اپنا ایک الگ ذائقہ ہے، لیکن جن کہانیوں کو پڑھ کر چہرہ ''اشک رواں کی نہر ہے اور ہم ہیں دوستو'' کی تصویر بن جاتا ہے کہانی پڑھنے کے بعد آپ دیر تک اس کی گرفت میں رہتے ہیں، جیسے ''مدھوبالا'' کی کہانی تو ختم ہو جاتی ہے مگر پڑھنے والے کی سسکیاں کسی طور ختم ہونے کا نام نہیں لیتیں، لیکن پھر بھی مجھے کہنے دیں کہ خالد سہیل ملک کی کہانی

ملکوں ملکوں گھومتی جب بھی اپنے آنگن میں آتی ہے تو اس کی کہانی کی جولانی دیدنی ہوتی ہے، یہ آنگن دراصل اس کے سانسوں میں رچا بسا اور دل کی دھڑکنوں کے ساتھ اس کے سینے میں دھمال ڈالتا ہوا اس کا اپنا کھویا ہوا دلبر شہر پشاور ہے۔ جو اس کے دیکھتے ہی دیکھتے اور سے اور ہو گیا، لیکن پشاور کی کھوئی ہوئی ثقافت، تہذیب وتمدن، شوخ وشنگ اور بلا کی اپنائیت سے شرابور شادی بیاہ کی رسمیں تمام تر رچاؤ اور جزئیات کے ساتھ بیان کرتے ہوئے خالد سہیل ملک کہیں بھی کہانی سے اپنی کمٹ منٹ نہیں بھولتا اور دلبر شہر کی دل خوش کن اور کھلنڈری رسموں کے بیچ میں سے کہانی اٹھالاتا ہے میں نے کہا نا کہ وہ ایک سفاک کہانی کار ہے ابھی آنگن میں دو باراتوں کے آمنے سامنے آنے پر پشاور کی ایک مست والست رسم سے پورا بدن ٹپہ کھائی ہوئی گیند کی طرح کھلنڈرا ہو رہا ہوتا ہے کہ خالد سہیل ملک کہانی کا آخری پردہ گرادیتا ہے۔

''عرفانہ نے دیکھا کہ دونوں دولہوں نے ایک دوسرے کا حیا رکھ لیا تھا اور اب وہ ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔ باراتیوں کی تالیوں کی گونج میں دونوں باراتیں آگے بڑھنے لگی تھیں۔ اور۔۔۔ ''لیاقت جی! یہ باتیں سڑک پر کرنے کی نہیں ہیں۔ ولیمہ ختم ہوجائے تو گھر آجانا' عرفانہ نے اپنے برقعے کا نقاب ہٹاتے ہوئے کہا۔

''خیر ہے میں ''ٹڈیاں دی روٹی'' تک انتظار کرسکتا ہوں۔''

بے خیالی میں لیاقت کی آواز اونچی ہوگئی تھی۔

''مگر میں۔۔۔۔۔ میں انتظار نہیں کرسکتی''

کہتے ہوئے وہ آگے بڑھتی بارات کا حصہ بن گئی تھی۔''

سفاک قصہ گو یہاں تک پہنچ کر کہانی کا دروازہ اس سوال پر بند کردیتا ہے کہ

''نہ جانے اس نے لیاقت کے منہ سے نکلنے والی ''جی'' کی آواز سنی تھی یا نہیں۔''

اور میں اپنے قصّہ گو سے پوچھتا ہوں کہ ''کیا آپ نے'''' مگر میں۔۔میں انتظار نہیں کر سکتی'' پڑھتے ہوئے میری وہ چیخ سنی ہے جسے سن کر رفعت علی سیّد بھاگی ہوئی میرے کمرے میں آئی تھی مگر۔۔کچھ بولی اس لئے نہیں تھی کہ میرے تر بتر چہرے پر جیسے ساری کہانی لکھی ہوئی تھی۔

آپ۔۔۔نہیں، نہیں۔۔تُو۔۔خالد! تُو، تُو بہت بے درد ہے۔۔۔۔

جون 2021 کی آٹھویں صبح

مون سون

کہانی کار خالد سہیل ملک

وشمہ خان وشمہ کا نگار خانہ

تانیثی شعر و ادب کا مطالعہ کرتے وقت ادب کا رویہ یا تو مصالحانہ ہوتا ہے یا پھر ہمدردانہ ہوتا ہے۔یعنی دونوں صورتوں میں صحیح معنوں میں پرکھ پرچول نہیں کی جاتی۔ سیانے کہتے ہیں کہ ادب کی گاڑی میں زنانہ مردانہ ڈبے نہیں ہوتے۔اس لئے شعر کا تجزیہ کرتے وقت بس شعر کو ہی دیکھا اور پرکھا جائے خاتون شاعرہ ہونے کی وجہ سے کوئی رعایت نہ برتی جائے مگر بدقسمتی سے بعض خواتین اس رعایت کو پسند کرتی ہیں اس کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ انہیں اپنی شاعری پر خود سے کبھی مکالمہ کی ضرورت نہیں پیش آتی۔بس ادبی محفل کی اس تعریف کو جس میں انھیں میرؔ اور غالبؔ کے ہم پلہ قرار دے جاتا ہے اس پر ہی دونوں بھی فریق خوش ہو جاتے ہیں اور پبلک بھی تالی بھی بجا دیتی ہے۔

اس لئے کسی خاتون کی شاعری پر بات کرتے ہوئے میں اپنے آپ کو ہمیشہ رسّے پر چلنے والے بازیگر کی طرح محسوس کرتا ہوں۔اور میرے لئے احتیاط کی دائیں بائیں ہوتی ہوئی چھتری کے ساتھ توازن برقرار رکھنا مشکل ہوتا ہے، تاہم کبھی کبھی ایسی مہم جوئی کرنا اچھا لگتا ہے بس شرط یہ ہے کہ امکانات کی سرنگ کے دوسرے طرف کی روشنی حوصلہ افزائی پر آمادہ ہو۔ میں نے گزشتہ کئی برسوں میں وقفے وقفے سے آنے والی

ایک بہت ہی پرُ گوشاعرہ وشمہ خان وشمہ کے تین شعری مجموعے پڑھے ہیں، شاید ان پر اپنے کالموں میں مختصر تعارفی تبصرے بھی کیے ہیں۔ مجھے وشمہ خان وشمہ کے شعر سے ایک گونہ دلچسپی اس وقت پیدا ہوئی جب مجھے ان کے حوالے سے یہ معلوم ہوا کہ ان کا تعلق میرے صوبے خیبر پختونخوا سے ہے۔ دوسرے یہ بھی کی وہ سیلانی ہے اور ملکوں ملکوں گھومتی ہے۔ میرے نزدیک یہ دونوں حوالے معتبر ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ خیبر پختونخوا کی سنگلاخ زمینوں میں رزق پیدا کرنے والی مارشل قوم کے افراد اپنے عمل اور ردِعمل میں دوٹوک ہونے کے باوجود محبتیں کرنے بلکہ بتانے والے اور مصلحتوں سے نابلد بہت معصوم لوگ ہوتے ہیں گویا ''ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم'' وہ تو اپنے ان جانی دشمنوں کے بھی محافظ بن جاتے ہیں جو ان کی پناہ میں آ جاتے ہیں۔ اور دوسری طرف ملکوں ملکوں گھومنے والے تحقیقی تجربوں سے گزرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اور ایسے جہاں گشت لوگوں کے بارے میں میرے گرو جی (غالب) نے کہا ہے کہ

رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم
بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

تو جس شاعرہ میں اپنے جنم بھومی کی معصومیت اور سفر سے حاصل ہونے والی چالاکی کے یہ دونوں کمال موجود ہوں اس کے شعری منظرنامہ میں لال اور نیلے رنگ بیک وقت نمایاں ہوتے ہے، لال رنگ جو محبت کے پرشور جذبوں سے عبارت ہوتا ہے اور نیلا رنگ جو گہری خاموشی اور سکون سے تشکیل پاتا ہے۔اس کی تین گزشتہ کتابوں یعنی ''سرگوشیاں، جانِ محسن اور صاحب اور میں'' یہ دونوں رنگ ساتھ ساتھ چلتے نظر آتے

ہیں۔

قطرہ قطرہ جو ٹپکتا ہے تیرا غم مجھ میں
میں کسی روز تیرے درد سے بھر جاؤں گی

اب جو اس پرُ گو شاعرہ وشمہ خان وشمہ کا ایک تازہ مجموعہ ''عکسِ وشمہ'' آنے والا ہے، جس کا مسودہ پڑھنے کا مجھے موقع ملا ہے تو میرے اس خیال کو مزید تقویت ملی ہے کہ یہ جو میں نے اس کے شعری منظر نامہ کو لال اور نیلے رنگ سے عبارت قرار دیا ہے، انہی دو رنگوں سے وشمہ خان نے ایک خوبصورت اور آراستہ نگار خانہ ترتیب دیا ہے اس نگار خانے کا ساری تصویریں دلکش بھی ہیں اور بولتی بھی ہیں۔

چمکا ہے چاند آج در و بام پر اگر
چہرے پہ میرے درد کی تنویر دیکھئے

منظر رات کا ہے چاندنی رات کا جسے نیلے رنگ سے دکھایا جاتا ہے اور درد کی تنویر سے چہرے کا لال رنگ مل کر کیا پینٹنگز بناتی ہیں بس اسی طرح کی کبھی نظر آنے والی اور کبھی صرف احساس کو چھونے والا کلر کمبی نیشن سے دو ہجرتوں اور سفر کے استعاروں سے پینٹنگز بناتی ہوئی وشمہ خان وشمہ اپنا شعری نگار خانہ سجاتی ہے۔ وہ زندگی کو پرُ بہار دیکھنے کی آرزومند ہے زندگی کے چہرے سے کدورتوں کے غبار دھو کر اس پر محبت کا نکھار لانے کی خواہشمند ہے۔

کب برسے کی پیار کی بارش
کب سے گرد و غبار میں گُم ہوں

اسے خبر ہے کہ آج کی جن مسموم فضاؤں میں ہم سانس لے رہے ہیں وہ دنیا رہنے کے

قابل نہیں ہے۔

یہاں دم توڑتی فضاؤں میں
زندہ رہنا کمال ہے وشمہ

مگر پھر بھی اس کا ایقان اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اس دنیا کو محبت سے شرابور کر کے رہنے کے قابل بنایا جا سکتا ہے، بس شرط یہ ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا رہنے کی بجائے ''اپنے حصے کی کوئی شمع جلائی جائے'' حوصلہ اور کمٹمنٹ کے اسی اونچے سنگھاسن سے وہ پورے اعتماد سے کہہ اٹھتی ہے:

اس زندگی کی رہ پر شکوے گلے مٹا کر
آئے ہیں ہم تو صاحب سب کشتیاں جلا کر

ہجر کی ماری وشمہ خان وشمہ ہجرتوں کو وسیلے بنائے محبتوں کے اس سفر میں بے تکان چلی جا رہی ہے، اور اس سفر کی کیاریوں میں اس کی روح عمدہ شعروں کے پھول اگانے پر مامور ہے، اب یہ اس کی ریاضت پر منحصر ہے کہ وہ ان سرخ اور نیلے رنگ کے پھولوں کو موسموں کی حدتوں اور شدتوں سے کیسے بچاتی ہے، میرے نزدیک اس کا نسبتاً آسان طریقہ یہی ہے کہ خوشبو کو ہوا کے ہاتھوں میں سونپنے سے پہلے دلجمعی کے ساتھ اس سے ایک منطقی مکالمہ کیا جائے۔

جون 2016ء کی 11 ویں صبح

صاحب اور میں
شاعرہ وشمہ خان وشمہ

دوستی کا ہاتھ بڑھاتی ہوئی سفری دستاویز

مجھے سفر کرنا بھی اچھا لگتا ہے اور سفر نامہ پڑھنا بھی میرے پسندیدہ مشاغل میں شامل ہے، لیکن بہت گھومنے کے باوجود میں نے خود باقاعدہ کوئی سفر نامہ نہیں لکھا، باقاعدہ اس لئے کہ بیرون ملک سفر کے دوران میرے جو کالم شائع ہوتے ہیں ان میں سفر نامہ کی ایک جھلک ضرور مل سکتی ہے، لیکن سفر ختم ہوتے ہی میرے کالم میں دور دیاروں کا ذکر بھی تمام شد۔ میں غالب تو ہوں نہیں جس نے بڑی سہولت سے کہہ دیا تھا

ہوسِ سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو

کیونکہ ہوسِ سیر و تماشا تو کسی طور کم ہونے کی نہیں خود کہیں نہ جا پاؤں تو اللہ بھلا کرے سفر نامہ نگاروں کا کہ وہ سیر و تماشا کی ہوس کی تشنگی کا سامان مہیّا کر دیتے ہیں، اس لئے جب میں کوئی سفر نامہ پڑھتا ہوں تو میں سفر نامہ نگار کے ساتھ ہی ہو لیتا ہوں، لیکن سچی بات یہی ہے کہ کم کم لکھنے والے پڑھنے والوں کو ساتھ لے کر چلنے کے ہنر سے آشنا ہوتے ہیں، اس لئے بہت کم تحریریں اپنا طرفدار بناتی اور دوستی کا ہاتھ بڑھاتی ہیں، امجد عزیز ملک سے میری دوستی چار دہائیاں دیکھ چکی ہے، اس لئے میں اس کو اس حوالے سے بہت جانتا ہوں کہ جب وہ ایک بار کچھ بھی ٹھان لے اور بھلے سے لوگ اس کام کو دیوانے کی بڑ ہی کہیں، امجد عزیز ملک نہ صرف اس کام کو ممکن بناتا ہے بلکہ

اپنے سینے پر سرخروئی کے تمغے بھی سجا لیتا ہے، سفر کا وہ ہمیشہ سے خوگر ہے، پھر سپورٹس سے محبت بھی اس کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی کرم ہے کہ وہ دونوں کام یکساں جوش و جذبے کے ساتھ کرتا چلا آیا ہے، لکھنے پر آیا تو سپورٹس کے حوالے سے کئی انمول کتب پڑھنے والوں کو دیں ایک زمانے میں اسے فوٹوگرافی کا تھا تو ایسی بولتی تصویریں بنائیں کہ چپ ہی کرا دیا اور جب میں نے امجد عزیز ملک کا چند برس پہلے پشاور سے سوچی براستہ استنبول پڑھا تھا تو اس شخص نے مجھے بہت حیران کیا تھا کیونکہ اسے جو عبور کل فوٹوگرافی پر تھا وہی تکنیک مجھے اس کی تحریر میں نظر آئی تھی، ایسی تصویریں بناتی ہوئی تحریر کا ملکہ بہت کم کسی کو ودیعت ہوتا ہے، اور اب جب میں نے امجد عزیز ملک کے دوسرے سفرنامے کی سیر شروع کی تو مجھے آغاز ہی میں چونکنا پڑا جب اس نے لکھا ''قطعاً ارادہ نہ تھا کہ غیر ملکی دوروں سے متعلق ایک اور سفرنامہ لکھا جائے؛'' بس اس پہلی سطر نے ہی مجھے اپنی گرفت میں لے لیا، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ انکار سے شروع ہونے والی تحریریں بلا کی اپنائیت لئے ہوتی ہیں مجھے اس کا پہلا تجربہ ممتاز مفتی کی لبیک پڑھتے ہوئے ہوا تھا، اور پھر جب امجد عزیز ملک نے سفرنامہ لکھنے کی وجہ بتائی تو میری طرح ہر پڑھنے والا اسی لمحہ ہٹس آف کر دیتا ہے، کل کی بات ہے جب اسی شہر پشاور کے بے بدل شاعر خاطر غزنوی نے کہا تھا۔

کیا قیامت ہے کہ خاطرؔ کشتۂ شب تھے بھی ہم
صبح بھی آئی تو مجرم ہم ہی گردانے گئے

اسی طرح جب امجد عزیز ملک کو سپورٹس جرنلسٹس کی عالمی تنظیم کی وساطت سے دنیا کے ایک سو چار ممالک کے مندوبین سے گفت وشنید کا موقع ملا تو اسے حیرت ہوئی کہ

پاکستان جو دہشت گردی کے خلاف جنگ میں جھلستے جھلستے اور ہزاروں بے گناہ شہریوں اور فورسسز کے جوانوں کی قربانیاں دے کر خود کو معاشی طور پر بھی تباہی کے دہانے تک لے آیا ہے خصوصاً پشاور جو سب سے زیادہ متاثر ہوا ہے مگر، باہر کی دنیا، پاکستان اور بطور خاص پشاور کے باسیوں کو ہی دہشت گرد قرار دے رہی ہے، پشاور کہتا ہی رہ گیا۔

کجا دانند حال ما سبکساران ساحل ہا

اور یہ بات ایک سچے پاکستانی اور پشاور کی محبت میں شرابور امجد عزیز ملک کے لئے کسی قیامت سے کم نہ تھی، اس کے لئے یہ بات اور بھی تکلیف دہ تھی کہ کھیلوں کی دنیا کے زعما بھی جن کا نصب العین ہی ایک صحت منداور پر امن معاشرے کی تشکیل ہے وہ بھی اصل حقائق سے بے خبر تھے، میں نے کہا نا کہ امجد عزیز ملک جب کسی بھی کام کو انجام تک پہنچانے کی ٹھان لیتا ہے تو پھر کوئی طاقت اس کے راستے کی دیوار نہیں بن سکتی، اس لئے دنیا بھر سے شریک سو سے زیادہ مندوبین کو وہ یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گیا کہ دوستو!

ہمارے نام سے منسوب یہ جھوٹی کہانی ہے

ہم دہشت گرد نہیں ہم تو امن سے محبت کرنے والے ہیں اللہ کی مخلوق سے پیار تو ہمارا جزوِ ایمان ہے اور اسی امن اور شانتی کے لئے ہم نے خود کو جنگ کے بھٹی میں جھونکا ہوا ہے، امجد نے اپنا یہ کیس اتنی مہارت سے لڑا کہ نہ صرف پاکستان کے بارے میں مندوبین کی سوچ میں ایک واضح تبدیلی آئی بلکہ سپورٹس جرنلسٹس کی عالمی تنظیم (AIPS) کی 88 سال کی تاریخ میں پہلے بار کسی پاکستانی کو اس تنظیم کی ایگزیکٹیو کمیٹی

کارکن منتخب کیا گیا جو ظاہر ہے امجد عزیز ملک ہی تھا مگر یہ تنظیم کی مہربانی نہیں تھی، یہ اللہ تعالیٰ کا احسان اور امجد کی اپنے ملک اور شہر سے پرخلوص محبت کا صلہ تھا۔ میں جوں جوں امجد عزیز ملک کے ساتھ اس سفر میں اس کی دلکش اور رواں دواں تحریر میں بھیگا ہوا آگے بڑھتا رہا مجھے بہت آسودگی ملتی گئی کیونکہ نئی دنیاؤں کی سیر کو نکلا ہوا یہ سیلانی ہر گھڑی پرائے دیس کے حسن اور رنگینی سے سرشار ہوتا رہا مگر کسی بھی لمحے وہ اپنے ملک اور اپنے شہر کو بھلا نہیں پایا، اور نہ ہی کسی لمحے وہ اپنے اندر کے سپورٹس جرنلسٹ سے غافل رہا، پہلے پڑاؤ پر جب وہ دوحہ قطر پہنچتا ہے تو اس ملک کی تاریخ، ترقی اور خوشحالی کی عمدہ تصویر کشی کرتے ہوئے مڑ مڑ کر اپنے وطن کے ساتھ غیر محسوس موازنہ بھی کرتا اور کھیلوں کی دنیا سے اپنے جڑے رہنے کا اعادہ بھی کرتا ہے جیسے وہ دوحہ کے نئے خوبصورت حماد انٹرنیشنل ائیر پورٹ کے توسیعی منصوبے کی بات کرتا ہے تو اس کی بڑی وجہ وہ 2020 میں عالمی فٹبال مقابلوں کا انعقاد قرار دیتا ہے اور پھر تفصیل کے ساتھ بتاتا ہے کہ ایشیا کی تاریخ میں پہلی بار فٹ بال کے عالمی مقابلے کسی عرب ملک میں ہو رہے ہیں، یعنی وہ عمومی معلومات سے کھیلوں تک کے سارے ذائقے اپنے پڑھنے والے سے شئیر کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور پھر وہ کسی بھی ملک کی خوشحالی کو رشک سے دیکھتے دیکھتے آن کی آن پاکستان کی فضا میں ٹرانسپورٹ ہو جاتا ہے، اور سوچتا ہے کہ دنیا کتنی آگے نکل گئی اور ہم جو کبھی ''باکمال لوگ لاجواب پرواز'' کے احساسِ تفاخر کے ساتھ سرخیل تھے اب کہاں کھڑے ہیں وہ خود بھی اعتراف کرتے ہیں۔ ''نہ جانے جب بھی سفر میں ہوتا ہوں تو ہر شے کو پاکستان سے کیوں ملانے لگتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ کئی ملک جو ہمارے بعد آزاد ہوئے اور ترقی کی بلندیوں تک پہنچ گئے۔

اس نہ جانے کا سیدھا سادا جواب یہی ہے کہ امجد باہر کی دنیا کی چکا چوند میں اپنی دھرتی ماں کو کبھی نہیں بھلاتا، ''ایاز قدر خود بشناس'' کی گٹھڑی اس کے زادِ سفر میں شامل رہتی ہے۔ وہ قطر کی سیر کے دوران پوری تفصیل کے ساتھ اپنے پڑھنے والے کو معلومات فراہم کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے، ان معلومات میں بھی کھیلوں کے مقابلوں کی تفصیل موجود ہے اور ساتھ ہی جب وہ نئے بنے ہوئے شاپنگ مال ''ویلا جیو مال'' پہنچتا ہے تو خریداری سے اس لئے ہاتھ اٹھا لیتا ہے کہ ایک تو یہ سفر کا پہلا پڑاؤ ہے اور پھر پاکستانی روپے کی گراوٹ نے ہر چیز کی قیمت کئی گنا بڑھا دی ہے، اسی طرح جب وہ قطر میں پاکستان سکواش کوچ عمر زمان سے ملتا ہے تو جہاں اسے دیوار پر لگی ایک ریکٹ سرشار کر دیتی ہے کیونکہ اس ریکٹ سے قمر زمان نے 1975 کی برٹش سکوش چیمپئین شپ کا فائنل جیتا تھا۔ وہاں اس کو یہ احساس بھی افسردہ کر دیتا ہے کہ عمر زمان کے بیٹے عمیر بھی سکواش کی دنیا میں اپنی اڑان بھر چکے ہیں لیکن ان کے نام کے آگے پاکستان کی بجائے قطر لکھا ہوا ہے، ایسے کئی جذباتی واقعات کی کڑیوں سے اس سفرنامے کی قوی اور دیدہ زیب زنجیر ترتیب پاتی ہے، ہنگری کے بارے میں جب امجد عزیز ملک کا اشہب قلم دلکی چال کے ساتھ اس ملک کی پوری تاریخ اور اہم واقعات ہی نہیں قابل دید مقامات، کھیل' ثقافت، ادب، موسیقی، سائنس اور ٹیکنالوجی سے جڑی ہوئی سرگرمیوں کو ایک سبھاؤ اور دریا کے سے بہاؤ کے ساتھ تحریر کرتا ہے تو اس روانی سلاست اور بے پناہ برجستگی کے ساتھ پڑھنے والے کو مسحور کر دیتا ہے، یہاں بھی وہ جب انسانی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے ہنگری کے 45 ویں نمبر پر اور معاشی طاقت میں 58 ویں ملک ہونے کی بات کرتا ہے تو اس کا دکھ سوا ہو جاتا ہے جب پاکستان کا سوچتا

ہے جو ہنگری سے سو درجے نیچے ہے۔ یا جس ہوٹل میں اس کا قیام ہے اس کے بارے میں اسے علم ہوتا ہے کہ یہ کبھی سینما ہال تھا تو ذہن فوراً پشاور کے سینما ہالوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ مجھے یہ بھی اچھا لگا کہ امجد عزیز ملک جب کھیل کی دنیا میں اپنے سینئرز خصوصاً ایس ایم نقی کا ذکر کرتا ہے تو محبت، خلوص اور احترام میں بھیگ بھیگ جاتا ہے، اور سیکھنے کے عمل سے کبھی اور کہیں بھی اپنی انگلی نہیں چھڑاتا، ہر چند جب وہ وقت کی پابندی کی بات کرتا ہے اور ہر جگہ مقررہ وقت سے پہلے پہنچ جاتا ہے تو میرے لئے یہ پڑھنا قدرے ادق مشق تھا کہ میں نے تو ویسے بھی کچھ نہیں سیکھا مگر وقت کی پابندی تو جیسے میرے لئے بنی ہی نہیں، مجھے امجد کے ساتھ ہمزاد کی طرح سیر کرنا بہت اچھا لگا خصوصاً جب فٹ بال سٹیڈیم میں فٹ بال کو کک لگانے کا مرحلہ آیا جسے امجد گول میں کنورٹ نہ کر سکا تو مجھے پشاور کے ارباب نیاز سٹیڈیم میں گورنر سرحد گولڈ کرکٹ کپ کے مقابلوں کی ایک افتتاحی تقریب یاد آئی جب ایک وزیر (اب مرحوم) نے بلا تھاما اور انتہائی سلو ایک بال اس کی طرف لڑھکائی گئی تا کہ وہ اسے ہٹ کر کے افتتاح کر سکیں تو بدقسمتی سے وہ رنز نہ کر سکے اور بال وکٹ کو جا لگی۔۔ میں اس وقت تقریب کا آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہا تھا میرے منہ سے بے ساختہ اور بے ارداہ یہ جملہ نکلا، کہ دوستو یہ پہلا موقع ہے وزیر موصوف دن کے وقت بھی ''آؤٹ'' ہو گئے، جس کی بازگشت پھر بہت دیر تک سنائی دی، خیر ہنگری کے بعد ناروے کی اور سفر کرتے ہوئے بلا کی روانی اور سلاست سے امجد عزیز ملک نے ناروے کی پوری تاریخی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی صورتِ حال کا احاطہ ایسے کمال سے کیا کہ بے اختیار اسے داد دی، مجال ہے کہ اس بظاہر خشک اور غیر دلچسپ موضوع پر کوئی ایک لفظ بھی بوجھل یا

اکتاہٹ لئے ہوئے ہو یا تحریر کی روانی میں کوئی کھنڈت پڑی ہو ان مقامات کا ذکر بیشتر سفر ناموں میں ''ڈریگ'' ہو جاتا ہے مگر امجد ہوا کے نرم جھونکے کی طرح ہلکے پھلکے انداز سے آگے بڑھتا ہی نہیں اپنے پڑھنے والے کو بھی ساتھ لئے چلتا ہے، یہ ہنر اللہ کی دین ہے۔ ناروے سے بھی امجد عزیز ملک کی دلچسپی اس بنا پر دگنی تھی کہ ایک تو ناروے نے پاکستان کو قیام کے پہلے ہی برس تسلیم کیا، پھر پاکستانیوں کی ایک بڑی تعداد کا ناروے میں مقیم ہونا تھا اس پر مستزاد پاکستان کے سفیر ظہیر احمد خان سے ملاقات جو کہ ایک سینئر سفارت کار ہیں اور جن کی سوچ سب سے پہلے پاکستان کی غماض ہے، پھر وہ ہمارے مشترکہ دوست ملک سعد شہید کے ہمدم دیرینہ تھے اس لئے گفتگو میں پشاور اور پشاور میں ہونے والی دہشت گردی کا ذکر نمایاں رہا، اوسلو کے تھیٹر میں 80 کی دہائی میں پشاور میں ہونے والی ثقافتی سرگرمیوں کا بھی ذکر تھا اور پشاور سٹیج کو ایک طویل وقفے کے بعد سٹیج ڈراموں کا آغاز کرنے والی تنظیم کا ذکر کئے بغیر ڈراموں کا حوالہ دیا، یہ تنظیم فرنٹیئر آرٹس پروموٹرز تھی، جس میں میرے سمیت کئی دوست شامل تھے مگر اس تنظیم کے جنرل سیکرٹری اور روح و رواں امجد عزیز ملک ہی تھے۔ مقطع میں ایک سخن گسترانہ بات پشاور کے محکمۂ ثقافت کے ان ماہانہ وظائف (امداد) کا ذکر بھی آ گیا ہے جسے ''ثقافت کے زندہ امین'' کا نام دیا گیا مگر ''غلط بخشیوں'' کی بنا پر اسے چند ماہ بعد معطل کر دیا گیا، مزے کی بات ہے کہ فنکاروں کو تو تیس ہزار مہینہ کے حساب سے محض چند ماہ تک یہ امداد ملی مگر جس کمیٹی کے ذمّے فنکاروں کا چناؤ تھا شنید ہے کہ اس کمیٹی کے ہر رکن کو یکمشت لاکھوں روپے اعزازیہ کے نام پر پیشگی ہی ادا کئے گئے، لیکن امجد عزیز ملک نے جہاں اوائل ہی سے کھیل سے

رشتہ استوار کیا تھا وہاں وہ ثقافت سے بھی جڑے ہوئے تھے،اور پشاور سے باہر کی دنیا کو پہلی بار پاکستان بھر میں روشناس کرنے کا سہرا بھی امجد کے سر ہے کہ اس نے ممتاز اور بڑے سوشل میگزین اور ٹی وی جریدوں میں پشاور کے فنکاروں کی فل پیج کلر پیج پکچرز کے ساتھ ان کا بھرپور تعارف لکھا،اور یہ تصویریں بھی امجد عزیز ملک کی فوٹو گرافی کا شہکار ہوتیں، میں نے شروع میں جو کہا وہی میری آخری بات بھی ہے۔اور مجھے یقین ہے کہ آپ بھی اس،خوبصورت، شگفتہ، دلکش اور دل کو کہیں بہت اندر سے چھونے والے سفر نامہ کو پڑھتے ہوئے، میرے ہمزباں ہوں گے۔کہ۔۔"ایک زمانے میں اسے فوٹوگرافی کا تھا تو ایسی بولتی تصویریں بنائیں کہ بہت سے پروفیشنلز کو چپ کرادیا۔اور جب میں نے امجد عزیز ملک کا چند برس پہلے پشاور سے سوچی براستہ استنبول پڑھا تھا تو اس شخص نے مجھے بہت حیران کیا تھا کیونکہ اسے جو عبور کل فوٹوگرافی پر تھا وہی تکنیک مجھے اس کی تحریر میں نظر آئی تھی، اور ایسی تصویریں بناتی ہوئی تحریر کا ملکہ بہت کم کسی کو ودیعت ہوتا ہے۔"

2022 کے چھٹے مہینے کی 12ویں ابر آلود صبح

دیس پردیس

مصنف:امجد عزیز ملک

گونگی ہجرت۔ نیا شعری البم

شعر کی چھاؤں میں زندگی بتانے والے گرد و پیش کی جو کہانی سناتے ہیں وہ کہانی کچھ اُن کی سنی ہوئی بھی ہوتی ہے کچھ دیکھی ہوئی اور کچھ اس سے بڑھ کر ان کی سہی ہوئی بھی ہوتی ہے۔ پشتو روزمرہ کے مطابق ''گرم وجگہ ہوتی ہے جہاں آگ جل رہی ہوتی ہے'' اس لیے شاعر جس کہانی کو سہہ رہا ہوتا ہے جب اسے اپنے لوگوں اور اپنے دور کو شاعری کی صورت لوٹا رہا ہوتا ہے تو اس کے اندر بھی قیامت بپا ہوتی ہے، وہ جانتا ہے کہ فی زمانہ سچی شاعری صحرا میں اذان کی طرح ہے، وہ یہ بھی جانتا ہے کہ گم گوش زمانہ سامنے کی تصویر دیکھ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ آج انمول کتابیں طاقچوں سے اٹھ کر فٹ پاتھوں پر آ گئیں ایسے میں طاہر حنفی جیسا خود آگاہ شاعر دکھ سے کہتا ہے:

پڑھنے والے کو کیا خبر اس کی
کرب جو صاحب کتاب سہے

میں کچھ دنوں سے 'شہر نارسا' کے شاعر طاہر حنفی کے تازہ مجموعہ ''گونگی ہجرت'' کے شعر کے ساتھ رہ رہا ہوں، رہ کیا رہا ہوں اس کی دوستی سے خود کو سرشار کر رہا ہوں، سچ کہتا ہوں اس ''گونگی ہجرت'' کی نظموں اور غزلوں کی پر کیف فضا ویسے تو بہت بولتی ہے مگر کبھی کبھی کوئی شعر ایسا چپ کرا دیتا ہے کہ جی کرتا ہے کہ بس اسی شعری کیفیت کی بکل

مار کر دم سادھے صدیوں بیٹھا رہوں۔ نئے مضامین کو سہولت کے ساتھ برتنے کا جو ہنر طاہر حنفی کو عطا ہوا ہے وہ الگ سے پڑھنے والوں کے ہونٹوں پر خاموشی کی مہر لگا دیتا ہے۔

ترویج محبت کی ایسے تو نہیں ہو گی
جنگل کے درختوں کو گملوں میں لگاتا ہے

مجھے اس شعری مجموعے کی سیر کے دوران بار بار یہ احساس ہوتا رہا کہ طاہر حنفی نے بہت سے شعراء کے برعکس خود کو کہانی سے الگ نہیں رکھا اور اپنے خوابوں اپنی محبتوں اپنی دوستیوں اپنے خساروں، محرومیوں، دل میں بسنے والے دلبروں کے بچھڑنے کے دکھوں اور نارسائیوں سے اپنے شعر کے خال و خد ابھارے ہیں، وہ گم شدہ ساعتوں کی کھوج میں نکلا ایک ایسا مسافر ہے سفر جس کے پاؤں سے لپٹے ہوئے ہیں وہ نگری نگری پھرتا ہے، اور اپنے شعر کو سنوارنے کے لئے نت نئے تجربے سمیٹتا، مشاہدے زنبیل میں بھرتا اور حسن محابا کی رعنائیوں کو آنکھوں میں بھر کر پیکر سخن میں ڈھالتا ہے، جس کی وجہ سے اس کا شعر اسی کی کہانی سناتا ہے اور ایسے عمدہ شعر تخلیق کرتا ہے:

تو بات کر کہ سلسلہ گفتگو بنے
ہونٹوں کو ایک لفظ پہ رکھ اور کتاب کر

تو مجھے لاجواب کر دے گا
کون جیتا ہے تجھ سے باتوں میں

طاہر میں اپنے لفظ وہاں بھول آیا ہوں
ابلاغ کا کھچاؤ تھا بس تیرے آس پاس

اور یہ شعر تو اس بلا کے محبتی اور دوستوں کے دکھ سکھ کے سارے موسموں میں دل و جان سے شریک طاہر حنفی کے کردار کی سچی تصویر ہے

سنتا نہیں میں بات کسی دوست کے خلاف
مجھ سے تعلقات نہ اپنے خراب کر

میں نے کہا نا کہ طاہر حنفی کا شعر اس کے اپنے روز و شب ہی کی کہانی سناتا ہے۔ طاہر حنفی کے اس شعری البم میں بیتے دنوں کے اور اوائل عشق کے کھٹے میٹھے ذائقوں کی تصویریں بھی قدم قدم دامن دل کھینچ لیتی ہیں۔

روشنی چومتی ہے خدوخال
نور اترا ہے ایک لڑکی پر
جل گئے سوچتے ہوئے تجھ کو
ہاتھ رکھے رہے انگیٹھی پر

آج یادِ رفتہ نے سیر کی پشاور کی
اب بھی قصہ خوانی میں چوڑیاں کھنکتی ہیں

گونگی ہجرت میں کئی صفحات پر پھیلے ہوئے کچھ اشعار ایسے بھی ہیں جن کے لفظ اور مصرعے بار بار دھندلا جاتے ہیں، آنکھوں میں دھواں بھرتے ہوئے یہ شعر طاہر حنفی نے اپنی شریک حیات کے یاد میں کہے ہیں جو زندگی کے اس موڑ پر بچھڑ گئی جب کہ دکھ

سکھ کے ساتھی کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔اب بچھڑنے والی کی یادیں ہیں اور طاہر حنفی کی تنہائی اور شعری ریاضت ہے جس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ اپنے دلبر جانی سے بچھڑنے کا وہ سفاک لمحہ طاہر حنفی کے دل کے کہیں بہت اندر رُک سا گیا ہے۔

لب ہلے نہیں لیکن، آنکھ سے کہا اس نے
میرے بعد رکھو گے کس طرح خیال اپنا

طاہر حنفی نے ساتھی کے بچھڑنے کے بعد گھر کی عمومی فضا کے کچھ واضح اور کچھ علامتی اور استعاراتی شعری پیکر بھی کمال ہنر سے تراشے ہیں، ایک شعر نے تو ایسی تصویر بنائی کہ شدت جذبات سے میرا چہرہ تر بتر ہوتا چلا گیا اور دل کی دھڑکن بہت بے ترتیب ہونے لگی، کچھ دنوں سے مجھے لگ رہا ہے کہ شاعری میں، بہت پس پردہ رہنے والے باپ کی محبت کا اعتراف اب ہونے لگا ہے۔ مجھے خیال آیا کہ کہیں باپ بیٹے کی محبت کے برملا اظہار کے حوالے سے رواں دہائی، کوئی نیا بیانیہ تو ترتیب نہیں دے رہی۔۔۔۔

بیٹے کو دیکھ کر میری آنکھیں چمک اٹھیں
طاہر وہ سو گیا ہے مرے پاؤں داب کر

جون 2019ء کی 27 ویں صبح

گونگی ہجرت
شاعر: طاہر حنفی

اب مسافر راستہ نہیں بھولتے۔

بچپن میں رات کو کہانی سنتے سنتے جب میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو جاتیں اور ماں کی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوتی اور پھر کہانی کے انجام سے بے خبر سو جاتا، تو صبح اٹھ کر ضد کرتا کہ مجھے رات والی کہانی پھر سنائی جائے تو ماں پیار سے سمجھاتی کہ دن میں کہانی سنانے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔ سو جہاں بچپن میں کہانی سے رشتہ جڑا، وہیں مسافر اور سفر سے بھی آشنائی ہوئی یوں بھی اس زمانے کی کہانیاں داستانوں کی گود میں پلتی تھیں اور داستانیں ہمیشہ سفر کے سہارے آگے بڑھتی تھیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مجھے سفر کہانی پڑھنا بہت اچھا لگتا ہے۔ لیکن کوئی کوئی سفر کہانی ایسی ہوتی ہے، جو دل کو کہیں بہت اندر سے چھوتی ہے۔ باقی سب کہانیوں کی لوح پر 'نشستند و گفتند و برخاستند' لکھا ہوتا ہے۔ ادھر مسافر نے واپس آ کر رخت سفر کھولا ادھر میں نے انگلی چھڑا کر بس اتنا ہی تعلق رکھا کہ اگر کسی نے استفسار کیا تو بتا دیا کہ جی ہاں پڑھا ہے۔ رات گئی بات گئی۔ مگر جو سفر کہانی کہیں دل کو اندر سے چھوتی ہے، مانو پیچھے ہی پڑ جاتی ہے۔ اور جب کبھی اکیلا ہوتا ہوں تو لفظوں سے بنی ہوئی تصویریں متحرک ہو کر اُسی ماحول میں ٹرانسپورٹ کر دیتی ہیں۔ اُس کیفیت میں تحلیل ہونا جوان علاقوں کی خوبصورتی کی مرہونِ منت ہے وہاں مسافر کی خوش دلی، جمالیاتی ذوق، زبان و بیان

پر مکمل عبور، اظہار قدرت اور حرف و لفظ سے رومینس بھی مجھے اس کا طرفدار بنا دیتا ہے۔ایسا ہی ایک مسافر ممتاز مفتی تھا اس نے ایک مقدس سفر کہانی سنانے سے پہلے کہا تھا۔میرے دن میں اس منزل کی طرف جانے کا کبھی خیال تک نہیں آیا تھا اور پھر اپنی کہانی میں جادوگری دکھائی کہ آج کتنی ہی دہائیوں کے بعد بھی اس کے سحر سے نکلنا محال ہے۔اور اب ایک زمانے کے بعد ایک اور مسافر نے اپنی سفر کہانی سے شرابور کر دیا ہے اس مسافر نے بھی آغاز ہی میں کہہ دیا ہے کہ میرے دل میں امریکہ دیکھنے کی خواہش کبھی نہیں جاگی مگر پھر یہ ان چاہی خواہش مسافر کے لئے بن گئی کیونکہ اب اسے عزیز از جان بٹیا کی گریجویشن کی تقریب کا سندیسہ ملتا ہے۔وہ جانتا ہے کہ اس دن کے لئے بٹیا کی محنت اور ریاضت اپنی جگہ مگر اس مسافر کی دعائے نیم شبی اور سحر گاہی نے بھی بھرپور حصہ ڈالا ہوا ہے۔اور اب اسی خواب کو تعبیر سے ہم کنار ہوتے دیکھنے کے کے راستے میں حائل ساری رکاوٹیں بے معنی ہو جاتی ہیں کیونکہ ایسے میں اندر کے سارے موسم سبز پوشاک پہن کر دھمال ڈالنے لگتے ہیں۔یہ دعاؤں کی قبولیت کی گھڑی ہوتی ہے۔انہونی ہونی ہو جاتی ہے۔یوں بھی بچوں کے سکول کے زمانے میں پیرینٹس ڈے میں شرکت بچوں کی دلجوئی کی خاطر کی جاتی ہے۔مگر ان کی گریجویشن کی تقریب میں شرکت کا فخر یہ لمحہ کوزہ کمریں سیدھی کر دیتا ہے اور دل مور بن کر سینے میں رقص کناں ہو جاتا ہے۔یہ مسافر میاں محمد آصف ہے جو اپنوں کے درمیان خوش رہتا ہے۔اور اسی عنوان سے ان کی کہانی ترتیب دیتے ہوئے اپنی صلاحیتوں کے ایسے گل کھلائے ہیں کہ مجھے یقین ہو چلا ہے کہ اب اس سحر سے نکلنے کے لئے اور اس طلسم کو توڑنے کے لئے ڈھونڈے سے بھی کوئی اسم، کوئی منتر کام آنے

والا نہیں ہے۔ میں نے اس سے پہلے میاں آصف کی کوئی تحریر پڑھی ہے اور نہ ہی ان سے کوئی ملاقات ہے۔ مگر میں نے سفر کہانی ''اپنوں کے درمیاں'' کے مطالعہ میں جو وقت بتایا ہے اس نے اجنبیت کی ساری دیواریں ڈھا دی ہیں اب مجھے اس کہانی میں موجود امریکی ریاستوں سے لے کر شہروں اور قصبات تک، فلائٹس سے لے کر ماکولات تک، بیٹا اور بٹیا سے لے کر بھابی اور میزبان فیملیز تک اور نظاروں سے لے کر کھٹے میٹھے موسموں تک سب کچھ اپنا اپنا لگنے لگا ہے۔ اور اس اپنائیت کا احساس اس وقت شدید ہو گیا جب اعزاز حاصل کرنے والی 518 طالبات کے نام پکارتے ہوئے پانچویں نمبر پر ایک نام پکارا گیا، امیمہ ایمن۔ یہ پڑھتے ہوئے میری آنکھوں میں بھی دھواں بھر گیا اور میاں آصف کے دل کی دھڑکن کے بے ترتیب ہونے والی سطریں دھندلا گئیں۔ میری کوئی بیٹی نہیں ہے مگر میرا اس بات پر ایمان ہے کہ بیٹیاں سانجھی ہوتی ہیں یہ بات میں نے اس لمحہ میں سوچی جب میاں آصف کے لئے وقت رک گیا تھا اور تقریب آگے بڑھ گئی تھی۔ وقت رک جائے تو انسان بھری محفل میں تنہا ہو جاتا ہے۔ اور پھر تنہائی کی اپنی اور ہی تقریبات ہوتی ہیں۔

تقریب تری یاد کی، کمرے میں بپا تھی
میں صدر بھی، سامع بھی تھا اور بول رہا تھا

میاں آصف نے اپنوں کے درمیاں میں اپنے قلم سے موقلم کا کام لے کر اور صریرِ خامہ کو کیمرے کی کلک بنا کر امریکہ یاترا کی جو پینٹنگز بنائی اور تصویریں کھینچی ہیں اس نے غالب کے اس زندہ مطلع پر بھی میرا یقین مستحکم کر دیا ہے۔

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

بن گیا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا

کیونکہ لفظوں کو برتنے کا جو سلیقہ اور قرینہ قلم کی قسم کھانے والے رب نے میاں آصف کو ودیعت کیا ہے وہ بہت سوں کو احساس کمتری میں مبتلا کرنے کا باعث بننے والا ہے۔ جب وہ تحریر کے معبد میں داخل ہوتا ہے تو مانو، لفظ اور ہم آواز لفظ تو جیسے ہاتھ باندھے اس کے سامنے کھڑے ہو کر اس کی نظر کرم کے منتظر ہوتے ہیں۔ اور پھر بڑی خوش سلیقگی سے وہ ان میں سے لفظوں کے موتی چن کر تحریر کی مالا میں پروتا ہے ایسی ہی مینا کاری اور مرصع سازی سے 'اپنوں کے درمیاں' کا سارا البم سارا کیٹلاگ بھرا پڑا ہے۔ عتیق کو عقیق بنانا، پشاور ہشتنگری سے ہشت پہلو شخصیت تک پہنچانا جلوس کو جلسہ میں ڈھالنا، گل کی کلی کھلانا اور فہیم کو فہم میں لانا تو اس کے چائے کا کپ بلکہ کافی کا سپ ہے۔ اسی طرح جب وہ لفظوں کو جوڑ کر بے ساختہ دلکش اور خوبصورت سطریں تخلیق کرتا ہے تو لگتا ہے اس کے ہاتھ میں قلم نہیں مرلی ہے جس کی مدھر تانیں سارے ماحول کو گھنگرو بندھا دیتی ہیں۔ آج امریکہ کا میموریل ڈے ہے میں نے کہا ہمارا بھی۔ سامان سفر حسب خواہش تھا، کاش حسب ضرورت ہوتا۔ جانے والوں کی صحبت میں جینا۔ بارش اور میزبانی کی شبنم۔ چار کی تقسیم اور چار دن کی دنیا۔ ہجوم کا مزہ اور فرصت کی رونق۔ آزاد ہونے کے لئے پابند ہونا۔ ہمارے ہاں کھیل کی آڑ میں کھیلے جانے والے کھیل۔ باتوں کی قینچی اور قصوں کی کترنیں اور تھکاوٹ سے چور مسرت سے مخمور۔۔ میں آخر کہاں تک سناؤں کہاں تک سنو گے مگر ان پھولوں سے ہی 'اپنوں کے درمیاں' کا گلدستہ ترتیب پاتا ہے۔ جن جگہوں تک میرا جانا نہیں ہوا، ان کی تصویریں

ذہن پر نقش ہو گئیں اور جن جگہوں کو ایک سے زیادہ مرتبہ دیکھا ہے ان کو بھی نئے سرے سے دیکھنے کی خواہش مجھے چھیڑنے لگی ہے۔ اس سفر کہانی میں حلقہ اربابِ ذوق نیویارک کے فعال سیکرٹری 'ڈائیلاگ والے' طاہر خان (جس نے چند ماہ پیشتر میری کتاب رونمائی کا ڈول ڈالا تھا) جیسے دوستوں کے ذکر کو تو میں نے احساس تفاخر کے ساتھ بار بار پڑھا اور خود کو سرشار کیا، لیکن دو باتیں ایسی ہیں جس نے میری نظر میں میاں آصف کو مزید قد آور اور معتبر بنا دیا ہے۔ چونکہ وہ خیبر پختونخوا پولیس سے جڑے ہوئے ہیں، پہلی بات تو اس صوبے کی پولیس فورس میں اب نظر آنے والی مثبت تبدیلیوں کا جا بجا اظہار کرنا مجھے بہت بھایا ہے، اور دوسری طرف قطرہ قطرہ اترتی رات میں لحہ لحہ دھڑکتے دل کے ساتھ ایمن اور اس کی سکھیوں کا جگمگ جگمگ کشتیوں کو کھیتے دیکھنے اور ہوا کو سننے اور محسوس کرنے والے میاں آصف نے کم سے کم لفظوں میں ایسی سنہری بات لکھ دی ہے۔ جو اپنے ہاں حسد کا جنجال پانے والوں کے لئے ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ یہ بات بہت دیر تک اور بہت دور تک روشنی دیتی رہے گی کہ

''یہاں لوگوں کے پاس اداس ہونے کے لئے وقت ہے نہ فرصت۔''

تاج محل کے بارے میں کیف بھوپالی نے کہا تھا

ایک کمی تھی تاج محل میں
میں نے تری تصویر لگا دی

میاں آصف نے 'اپنوں کے درمیاں کے' نام سے جو تاج محل بنایا ہے اس میں کمی تو کوئی نہیں بس یہ خیال مسلسل تنگ کرتا رہتا ہے کہ مہمانوں اور میزبانوں کے اس کہکشاں کا کوئی ٹمٹماتا ستارا میں بھی ہوتا جو اپنوں میں شمار ہوتا اور اتنے کم دنوں میں

اتنی زیادہ محبتیں سمیٹ سکتا۔اور ہاں یہ سفر کہانی دن کو بھی سنائی جاسکتی ہے۔کیونکہ اب مسافر جدید سہولیات سے آراستہ آلات کے ساتھ سفر کرتے ہیں۔اس لئے۔۔۔اب مسافر راستہ نہیں بھولتے۔

اپنوں کے درمیاں

مصنف: میاں آصف

دوریوں کے موسم میں سوالات کا سامنا

شعر وادب اپنے گرد و پیش میں ہی سانس لیتا ہے اور اپنے ماحول ہی کے مدار میں رہنا پسند کرتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے دور کا عکاس بھی ہوتا ہے اور اپنے زمانے کا مؤرخ بھی اور اپنے لوگوں کے دکھ سکھ میں ان کا رازدار بھی ہوتا ہے اور غمگساری تو جیسے کسی بھی جینوئن تخلیق کار کی گھٹی میں پڑی ہوتی ہے، کیونکہ اس کے بغیر تو شعر وادب کی قلمرو میں داخلہ کا اذن ہی نہیں ملتا۔ ان دنوں پورا گلوب ایک جان لیوا وبا (کووڈ19) کی لپیٹ میں ہے، اور ایک سچا قلمکار اس محاذ پر بھی پوری توانائی کے ساتھ اپنے لوگوں کے ساتھ کھڑا ہے، شعر کہے جا رہے ہیں، کہانیاں بُنی جا رہی ہیں اور تبصرے اور تجزیئے کئے جا رہے ہیں، انفرادی سطح پر ہونے والے اس کام کو دیکھیں تو ایسا لگتا ہے جیسے سارا قلم قبیلہ مل کر ایک طویل نظم لکھ رہا ہے، اپنے تجربات اور اپنے مشاہدات رقم کر کے آنے والے وقتوں کے لئے ایک مبسوط دستاویز ترتیب دی جا رہی ہے، لیکن مجھے اس وقت بہت حیرت ہوئی تھی، جب مجھے ممتاز و مقبول شاعرہ اور لکھاری و مدیر سہ ماہی جریدہ ’جگنو انٹرنیشنل، لاہور‘ ایم زیڈ کنول کا تازہ شعری مجموعہ ’’درد کی دہلیز پر‘ ملا تھا وبا کے دنوں میں کم کم شعرا کو چند اشعار، کچھ نظمیں یا چند غزلیں کہنے کی توفیق بھی ارزاں ہوئی ہے چہ جائیکہ کوئی شاعر پورا ایک شعری مجموعہ اپنے

پڑھنے والوں کے نام کر دے مگر ایم زیڈ کنول سے قدرت نے یہ کام لینا تھا سو لیا اور ابھی اس عمدہ مجموعہ کی روشنائی خشک بھی نہیں ہونے پائی کہ مجھے اس پُر گو شاعرہ کے ایک اور شعری مجموعے ''دوریوں کا موسم'' کا مسودہ ملا، اس مجموعہ کا فکری منظر نامہ بھی سرگوشیوں میں اپنے گرد و پیش اور محبت کے کھٹے میٹھے موسموں کی کہانی سناتے ہوئے پڑھنے والے کو فوراً اپنا طرفدار بنا لیتا ہے، اس مجموعہ کی عمومی فضا فطرت کو سمجھنے کی ایک کوشش ہے، یہ جو مظاہر ہیں یہ جو آنکھوں کے مدار میں گھومتی اشیا ہیں کیا یہ سب ایسی ہی ہیں جیسے نظر آتی ہیں، دیکھنے والوں کی اپنی دنیا اور اپنی حدود ہیں مگر جاننے والے ماورائے گمان آسمان میں اڑان بھرتے ہیں سو ان سے بہتر کون جانتا ہے کہ یہ مظاہر اور چاروں اور پھیلی اشیا بیک وقت کچھ دکھاتی بھی ہیں اور بہت کچھ چھپاتی بھی ہیں، اور یہ جو بظاہر سب کچھ دکھائی دے رہا ہے اس میں ایک پراَسراریت بھی ہے، جسے دیکھنے والی وہ آنکھ چاہئے جو شاعر کو ودیعت ہوتی ہے کیونکہ وہ پیمبرانہ بصیرت کا حامل ہوتا ہے۔ ''دوریوں کے موسموں میں'' بھیگتے ہوئے مجھے معلوم ہوا کہ یہ رتیں سرسری یا روا روی میں پڑھنے والوں سے قطعاً دوستی نہیں کرتیں۔ پھر یوں بھی ہے کہ ایم زیڈ کنول کی نامعلوم کو جاننے کی ایک شاعرانہ للک نے اس شعری مجموعے کو بہت معنی خیز بنا دیا ہے

نہ جانے کہہ دیا کیا فاختہ نے بلبل سے
درِ قفس پہ وہ اپنی اڑان چھوڑ گیا

یہ دنیا ایک حیرت سرا ہے اور ہر سانس ایک اور منطقے کی خبر لاتا ہے وہ جو میر نے کہا ہے نا

سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

تو دوریوں کا موسم اسی جہانِ دیگر کے اطراف میں سانس لیتا نظر آتا ہے، ایم زیڈ کنول اس حیرت سرا میں ایک معصوم بچے کی مانند کھوسی گئی ہے، اس لئے ہر قدم اسے پوچھنا پڑتا ہے، سوال کرنا پڑتا ہے، یہ سوال اس کے اند بہت شور مچاتے ہیں تو اسے وہ زبان شعر پر لاتی ہے، یہ اس کائنات کو سمجھنے کی اپنی سی ایک سعی ہے صدیوں سے انسان اس کائنات کی گتھی سلجھانے کی تگ و دو کر رہا ہے، کتنے ہی جاننے والے، فلیسوف، تخلیق کار اور غیر معمولی دماغ اس چیستان کی بھول بھلیوں میں اپنی عمریں گال کر یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ "اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے" بلکہ اس پر یہ اضافہ بھی کیا کہ "زندگی کا ہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا" لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ کوشش ترک کی جائے، پھر قرانی بصیرت بھی تو زمین کی سیر اور دیکھنے کی دعوت دیتی ہے، کائنات کو قابل تسخیر بنانے کی بات کرتی ہے۔ سو یہ تلاش یہ جستجو جاری ہے اور رہے گی، اور اس کا حل سوال میں ہے ایم زیڈ کنول نے یہ راز پالیا ہے اس لئے اس کے سوالات کتابوں سے زیادہ مظاہر فطرت سے ہیں اور وہ یہ جاننے کی کوشش کرتی ہیں کہ پھولوں سے ہوا سرگوشی میں کیا کہتی ہیں، آنے جانے والی رتوں کے ہونٹوں پر کیا پیغام ہے، یہ اشیا جانے آپس میں کیا باتیں کرتی ہیں۔ یہ مجموعہ مجھے بہت تنگ کرتا رہا، میرؔ نے کہا کہ ہر جہاں اک جہان دیگر تھا، مجھے تو اس شعری مجموعے نے بھی ایک سے ایک سوال کی زد پر دیر تک رکھا، سوالات کی بوچھاڑ میں شرابور میں آگے بڑھتا رہا، اس کی تفصیل کی بجائے میں چند شعر شئیر کرتا ہوں۔

کس نے نوچا گلوں کا پیراہن
گل و خوشبو سے پوچھنا ہے مجھے

جانے کیا کنولؔ بولے خوشبوؤں کے گھر آ کر
چار سو گلابوں نے اپنا رابطہ بھیجا

آ بلے ہو گئے کنولؔ سے خفا
جانے مرہم نے کیا کہا جا کر

کچھ مصرے دیکھئے

جانے کیا صبا بولی گوش زن صحیفوں سے
جانے صرصر نے صبا سے کیا کہا
جانے کیا جلتی ہتھیلی نے کہا

اور یہ شعر بھی دیکھئے

دل تو لگتا نہیں کتابوں میں
جانے لکھا ہے کیا نصابوں میں

پڑھنے والے ازخود ان اشعار سے لطف بھی لیں اور ایم زیڈ کنول کے شعر کے فکری منظر نامے کو سمجھنے کی کوشش بھی کریں اور ایسے ان گنت عمدہ اور دل کو کہیں بہت اندر سے چھونے والے اشعار ''دوریوں کے موسم میں'' کے ہر صفحے پر جگر جگر کر رہے ہیں، ان سے دوستی ہی نہیں پیار کیجئے جو بظاہر ایک ادق مشق لگتی ہے ہے مگر بہت سرشار کرتی ہے۔

2020 کے آٹھویں مہینے کی **13** ویں صبح

درد کی دہلیز

شاعر: ایم زیڈ کنول

ایک دل والی، دلی اور لکھنؤ کی فضاؤں میں

ایک بہت پرانی پاکستانی فلم (غالباً ہنی مون) میں ایک بار ایک مکالمہ عجب لطف دے گیا تھا، سچوایشن کچھ یوں تھی کہ ایک الٹرا موڈ دوشیزہ (فلمسٹار حسنہ) سے دوستی کا خواہشمند ہیرو (سید کمال) اسے مختلف حیلوں بہانوں سے اپنی محبت کا یقین دلاتا ہے مگر وہ رام نہیں ہوتی ایک دن وہ اسے سیر کرانے گاڑی میں بٹھا کر چھانگا مانگا کی طرف نکل جاتا ہے اور نسبتاً ایک ویران مگر خوبصورت جھنڈ میں گاڑی روک کر قریب ہی ایک لکڑی کے پل پر کھڑے ہو کر اس سے اظہار محبت کرتا ہے مگر حسنہ ہمیشہ کی طرح اسے کہتی ہے کہ ابھی تو ہم نے ایک دوسرے کو پوری طرح سمجھا نہیں پرکھا نہیں تو ایک ساتھ رہنے کا اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر لیں۔ کمال اسے کہتا ہے دیکھو! آپ شام کے وقت اس ویران جنگل میں میرے ساتھ آ گئی ہیں تو کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ کو مجھ پر اعتماد ہے۔؟

حسنہ ایک خاص ادا سے لہرا کر ہنستے ہوئے کہتی ہے۔ حضور یہ جو میں آپ کے ساتھ یہاں تک آ گئی ہوں تو ''مجھے آپ پر نہیں، اپنے آپ پر اعتماد ہے''۔ بہت دنوں بعد یہ منظر نامہ اور مکالمہ مجھے راشدہ ماہین ملک کی ہندیاترا کا مسودہ پڑھتے ہوئے یاد آیا۔ سیانے کہتے ہیں کہ کسی بھی دوست کی پہچان اس کے ساتھ سفر میں آسانی سے ہو جاتی

ہے، گویا سفر میں ہم سفر کا ہونا ویسے بھی ضروری ہے، چہ جائیکہ وہ سفر دوسرے ملک کا ہو اور دوسرا ملک اگر ہندوستان ہے تو سو بار سوچنا پڑتا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات ٹیپ سے جڑے ہوئے ہیں ذرا گرمی پڑی اور ٹیپ اکھڑ گئی اور ایسا سانحہ ان دنوں تو روز کا معمول ہے۔ اس لئے کسی ایسی خاتون کا، جو پہلے کبھی واہگہ بارڈر تک بھی نہیں گئیں، جانے انجانے ان راستوں پر بغل میں اپنے کلام کی پوٹلی دابے تنہا مردانہ وار نکل جانا اس کے قریبی بزرگ شعرا کو اگر اچھا نہیں لگا تھا تو وہ اس لئے حق بجانب تھے کہ ان کی سوچ فلمسٹار کمال کی سی سوچ تھی جبکہ راشدہ ماہین ملک کے اندر فلمسٹار حسنہ کا وہ مکالمہ سانس لے رہا تھا کہ ”مجھے آپ پر نہیں، اپنے آپ پر اعتماد ہے“ سو اسی اعتماد کی ڈوری سے بندھی وہ اسلام آباد سے لاہور واہگہ بارڈر کو پیدل عبور کر کے دیارِ غیر میں جا پہنچیں، جہاں سے اکیلے وہ امرتسر ریلوے سٹیشن سے گاڑی پکڑ کر دہلی اور وہاں سے لکھنؤ تک دوڑتی چلی گئیں اور انہیں راستوں سے کامیابیاں سمیٹے ہوئے واپس بھی آ گئیں اور ان روکنے والے بزرگوں کو اسی اعتماد کی اوڑھنی اوڑھ کر فیض کی زبان میں کہنے لگی

سب قتل ہو کے تیرے مقابل سے آئے ہیں
ہم لوگ سرخرو ہیں کہ منزل سے آئے ہیں

میں نے ہند یاترا کی یہ کہانی اس لئے بھی توجہ سے پڑھی ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کے ان گلی کوچوں میں کئی بار میں بھی دیوانہ وار غالبؔ غالبؔ اور میرؔ، میرؔ بہت پکارتا رہا ہوں۔ مگر میری آواز میری اپنی سماعتوں تک بھی نہیں پہنچ پائی تھی کیونکہ میں اکیلا نہ تھا کچھ دل کے قریب احباب بھی شریک سفر تھے۔ مگر راشدہ ماہین کو تنہا سفر کرنے کی سہولت حاصل تھی

سو وہ کبھی اپنا دل ٹٹولتی کہ جس میں ادب کے مشاہیر کے بیتے شب و روز کی دھڑکن دھمال ڈال رہی تھی اور کبھی وہ تاریخ کے پنے کھول کر در و دیوار اور طاقوں کے خدوخال تلاشنے بیٹھ جاتیں، اور جہاں جہاں وہ یہ قضیہ لے بیٹھیں پڑھنے والا بھی ستانے لگتا ہے، راشدہ نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ وہاں کا عام آدمی پاکستان سے آئے ہوئے مسافروں سے بہت پیار کرتا ہے، سوال جواب کے ذریعے تجزیہ کرنا اور فلسفہ بگھارنا پڑھے لکھے لوگوں کا وتیرہ ہے۔اور یہ ٹرینڈ دونوں طرف ہے، یوسف خان (دلیپ کمار) جب پشاور آیا تھا تو ایسے ہی ایک سوال کے جواب میں اس نے بھی کہا تھا ''بھائی مجھ سے فلم کی بات کرو جسے میں تھوڑا بہت سمجھتا ہوں'' تقسیم بہر حال ان کا پسندیدہ موضوع ہے۔ مجھے یاد ہے جب دہلی میں ایک دن رات گئے ہم مشاعرہ سے واپس ''بال بھون'' آرہے تھے تو علی جاوید کا جواں سال بیٹا گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ خاطرغزنوی ان کے ساتھ آگے بیٹھے ہوئے تھے اچانک ایک بغلی سڑک سے ایک کتا نکلا اور بھونکتا ہوا گاڑی کے ساتھ دوڑنے لگا، خاطرغزنوی کی رگِ ظرافت پھڑک اٹھی انہوں نے نوجوان میزبان سے کہا کہ حیرت ہے بیٹے آپ کے ہاں بھی کتے اُسی طرح چلتی گاڑی پر بھونکتے ہیں جس طرح ہماری طرف کے کتے بھونکتے ہیں، اس نوجوان نے فوراً جواب دیا ''انکل ان کو ابھی تک بٹوارے کا یقین نہیں آیا'' اور ہم سب چپ ہو گئے تھے۔۔سوان سوالوں کا سامنا دونوں طرف کرنا پڑتا ہے بہتری اسی میں ہے کہ کہہ دیا جائے کہ

ان کا جو فرض ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

کیونکہ اس موضوع پر کسی بھی سوال کے جواب سے بیسیوں اور سوال جنم لیتے ہیں، سفر نامہ میں بعض چھوٹے چھوٹے جملے اپنے اندر بڑی معنویت رکھتے ہیں۔ جیسے امرتسر ریلوے سٹیشن پہنچنے پر وہ لکھتی ہیں۔'اٹاری بارڈر سے امرت سر ریلوے سٹیشن تک پہنچنے میں کوئی چالیس پینتالیس منٹ لگتے ہیں۔ مگر مجھے محسوس ہوا جیسے میں کوئی طویل مسافت طے کر کے یہاں پہنچی ہوں۔ صدیوں کا سفر'' ''کوئل کی آواز دل کو ایسے لگی جیسے۔۔کوئی برہن کوک رہی ہو۔۔آج مجھے معلوم ہوا کہ اکلاپے کے دکھ سے کیسے کوک نکلتی ہے۔۔۔آج میں پردیس میں اکیلی تھی'' ''مجھے نہیں معلوم کہ اس کسمپرسی میں بے یار و مدد گار مرنے والی عورت کا کیا مذہب تھا وہ ہندو تھی، عیسائی تھی، پارسی تھی یا مسلمان تھی۔ ہاں مجھے اتنا معلوم ہے کہ وہ حوا کی بیٹی تھی۔'' راشدہ بنیادی طور پر شاعرہ ہیں اس لئے وہ اس سفر میں جہاں جہاں سے گذری ہیں ایک شاعر کی آنکھ ہی سے اشیاء کو دیکھتی رہیں یہی وجہ ہے کہ قدم قدم پر وہ اپنے آپ کو کسی نہ کسی شعر کے حصار میں پاتی ہیں جسے وہ اپنے قاری کے ساتھ شیئر کرتی چلی جاتی ہیں۔ یوں ایک دل والی، دلی اور لکھنؤ کی فضاؤں سے محبت کی وہ پھوار اپنی گٹھری میں باندھ کر لوٹی ہیں جو پڑھنے والوں کو بھی بیتے ہوئے زمانوں کے سحر سے شرابور کر رہی ہے۔

2016 کی جون کی 25ویں شب

اک دل والی دلی میں،

مصنفہ: راشدہ ماہین ملک

دیکھے ہوئے خوابوں کی تعبیر کھوجتا

ہمارے چاروں اور بے یقینی کی دھند گہری ہوتی جا رہی ہے، زندگی کرنا اب ایک ادق مشق بنتا جا رہا ہے، اب تو خود سے بات کرتے ہوئے بھی ایک نامعلوم سا خوف گھیر لیتا ہے کہ کہیں اپنے کان میں بھی سرگوشی کرنے سے بھی ہم محروم نہ کر دیئے جائیں، گرد وپیش کے سمجھ میں نہ آنے والے ان حالات نے سارے میں چپ اور ایک لمبی چپ کی عملداری کو مستحکم کر دیا ہے اور یہی وہ وقت ہوتا ہے جب کسی معاشرے میں احساس بیگانگی جنم لیتا ہے، جنم ہی نہیں لیتا روز بہ روز فربہ بھی ہوتا چلا جاتا ہے آج اسی کی وجہ سے بھرے شہروں میں ہر فرد تنہا ہو گیا ہے اکیلا رہ گیا ہے، اور پھر المیہ یہ بھی ہے کہ کسی کو اتنے بڑے نقصان کی بھی فکر لاحق نہیں ہے۔ ایسے میں حرف و لفظ کے قبیلے کا کوئی شعیب نوید بیگانگی کی اس سفاک رت میں شہر کی سونی گلیوں کی طرف نکل جاتا ہے اور پاگلوں کی طرح پکارتا پھرتا ہے کہ دیکھو۔۔۔

اس کی آنکھیں تو ہو گئیں پتھر
اب کسے آفتاب بیچو گے
شہر میں اب بچا نہیں کوئی
اب کسے تم گلاب بیچو گے

شعیب نوید کو فطرت نے ایک خوبصورت دل اور اپنے لوگوں کے دکھوں کو سمجھنے کا شعور بخشا' وہ اپنے لوگوں کو بہت سکھی دیکھنا چاہتا ہے اور ان کے لئے وہ ایک ایسی دنیا کے خواب دیکھتا ہے جو اس کے اپنے دل کی طرح خوبصورت اور پوتر ہو اس لئے وہ اپنے خوابوں کی رتھ پر سوار ہو کر شعر و ادب کی حسین وادیوں میں اترا ہے، حالانکہ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ شعر کا الہڑ اور بدمست گھوڑا ہر کسی کو اپنے ایالوں میں آسانی سے انگلیاں پھیرنے کی اجازت نہیں دیتا یہ الگ سے ایک ہنر ہے جو ایک لمبی ریاضت کا متقاضی ہے مگر شعیب نوید کو تو اپنے لوگوں کے دکھ مضطرب رکھتے ہیں، اس کے رت جگوں میں مسلسل اضافہ کرتے جاتے ہیں، ہمدرد اور غمگسار شعیب نوید اپنے لوگوں کے زخموں پر اپنے کومل لفظوں کے پھاہے رکھنا چاہتا ہے، اس کا شعر پڑھنے والے کے کانوں میں سرگوشی کرتا ہے کہ اسے ایک ایسی دنیا کی تلاش ہے جہاں وہ بہت سی دنیاؤں کو تسخیر کر کے دکھوں سے محفوظ ایک محبت کا قلعہ تعمیر کرانے میں کامیاب ہو سکے، اور دیکھے ان دیکھے بہت سے خوابوں کو ایک خوبصورت تعبیر سے ہم کنار کر سکے اور جس کے لئے اسے خود ہی ایک ضابطۂ حیات ترتیب دینا ہے، جہاں زبان نہیں آنکھیں بولتی ہوں، اس کے عمدہ شعر ہر قدم پر پڑھنے والے کو شعیب نوید کی آرزو کی یاددہانی کراتے ہیں۔

نیا آئین اپنے واسطے تحریر کرنا ہے
ہمیں دیکھے ہوئے خوابوں کو اب تعبیر کرنا ہے

آنکھیں بولتی ہیں
شاعر: شعیب نوید

ماضی کی طرف کھلنے والے دریچوں میں جھانکتی کہانی

پیچھے مڑ کر اپنے ماضی میں جھانکنا آخری عمر کا ایک پسندیدہ شغل بن جاتا ہے، ناصر کاظمی نے کہا ہے کہ ''جب دیواروں سے دھوپ ڈھلی تم یاد آئے'' دن کے ہنگاموں کی مصروفیت خود سے بات کرنے کی فرصت بھی کہاں دیتی ہے،'' البتہ شام ایک دلبر دوست کی طرح ہمیں یہ سہولت دیتی ہے کہ ہم چند لمحے اپنے پاس بیٹھ جائیں اور بیتے ہوئے دنوں کی چاپ سنتے سنتے اپنے کانوں میں خود ہی سرگوشی کرنے لگیں، مانو حال سے انگلی چھڑا کر ماضی کو اس طور یاد کرنا، ایک طرح سے آخری عمر کے عشق کی طرح ہوتا ہے جس کی چھاؤں میں پرسکون شامیں بتانا مجھے تو بہت اچھا لگتا ہے'' اور کچھ دن پہلے ایسی ہی ایک دلربا شام جب میری یادوں کی بارہ دری، ماضی کی گلیوں سے آنے والی معطر ہواؤں کے جھونکوں سے مہکی ہوئی تھی اور آنکھوں کے سامنے بیتے ہوئے کل کا البم ورق ورق کھلتی جا رہا تھا دل کو کہیں بہت اندر سے چھونے والے دلنشیں گداز لفظوں کی شال اوڑھے ایک ایسی کہانی بھی پاس آ بیٹھی جس کے ہاتھ میں ماضی کی گلیوں میں بھٹکنے والے ایک مہربان قصہ گو دوست کا ایسا روزنامچہ تھا جس میں کسی مسافر کی طرح اپنی جڑوں کی تلاش میں نکلا ہوا میرا مہربان قصہ گو ایک ایسے سفر کا قصہ چھو رہا تھا، چھیڑ رہا تھا جو مجھے مجھ سے ملا رہا تھا، مجھے میرے ہونے کا یقیں دلا رہا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا

کہ اس قصہ گو کے کیسے میں کتنی ہی سرکاری اور غیر سرکاری دستاویزات سے ترتیب پاتی ہوئی ڈیڑھ سو برس پہلے کے انگریز حکمرانوں کی اس علاقہ میں طرز حکمرانی اور یہاں کے باسیوں کی اس کے خلاف مزاحمت کی داستان بھی جگر جگر کر رہی ہے۔ اور میرا قصّہ گو جب اپنے معاشرے کے رہن سہن اور غیرت وحمیت کے خال وخدا جاگر کرتے ہوئے گزشتہ کل کی قلمی تصویریں کمال مہارت اور چابکدستی سے بنا تا ہے تو ماضی کی طرف کھلنے والے دریچوں میں جھانکتی ہوئی شام، ایسی کتنی ہی شاموں کو سرشاری میں شرابور گزرانے کا سامان مہیا کر دیتی ہے، یہ قصہ گو میرا یارِ عزیز فہیم صدیقی ہے جنھیں ان کی کتاب ''وادیٔ پشاور'' سے قبل میں نے ہمیشہ ہندسوں کے اطراف میں ہی اپنے روز وشب بتاتے ہوئے دیکھا،، ہر چند وہ ایک صاحبِ مطالعہ شخص تو ہیں لیکن اب ان کے قلم قبیلہ کی قلمرو میں کتاب بدست داخل ہونے نے مجھے یک گونہ اطمینان بھری خوشگوار حیرت سے دوچار کیا۔ پہلے پہل میں نے ایک شاعر و کہانی نویس پولیس آفیسر میاں آصف کے سفرنامہ میں فہیم صدیقی کا ذکر پڑھا تو ایک لمحہ کو یہی خیال گزرا کہ یہ فہیم صدیقی یقیناً کوئی اور صاحب ہوں گے کیونکہ یارعزیز تو ہندسوں میں ہی الجھے رہتے ہیں انہیں حرف ولفظ سے کب اتنی رغبت رہی ہوگی، مگر پھر میری ایک اداس شام کو بہت ہی ثروت مند بنانے کے لئے فہیم صدیقی ہمارے مشترکہ دوست ایڈیشنل انسپکٹر جنرل آف پولیس میاں محمد آصف کے ہمراہ میرے غریب خانہ یوں آئے کہ میرا ڈرائنگ روم بزبان حال گنگنانے لگا 'اک رات میں دو دو چاند کھلے' کیونکہ فہیم صدیقی بھی اس وقت اکاؤنٹنٹ جنرل خیبر پختونخوا میں ایک بڑے صاحب تھے، کئی گھنٹوں پر محیط اس شام مجھے صحیح طور پر ان کی ادب دوستی سے شناسائی ہوئی اس

سے قبل۔قلم قبیلہ سے جڑے ہوئے لوگوں سے ان کی بے پناہ محبت اور کچھ چنیدہ علمی اور ادبی محافل میں ان کی شرکت نے مجھے ان کا طرفدار بنایا ہوا تھا،لیکن ایک زیرک قلم کار اور بلا کی دلنشیں نثر لکھنے والے فہیم صدیقی سے میں پہلی بار مل رہا تھا، یہ ملاقات ان کے چھوئے ہوئے اس قصے کے اطراف میں ہو رہی تھی جس کے بارے میں، میں کہہ چکا ہوں کہ ایک ایسا قصہ ’جو مجھے مجھ سے ملا رہا تھا، میرے ہونے کا مجھے یقیں دلا رہا تھا ‘‘’قصہ خوانی کے قہوہ خانوں اور دکانوں کے تھڑوں پر بیٹھ کر اپنے بچپن، لڑکپن اور جوانی کے دوستوں سے گپ شپ کرنے اور اس بازار سے نکلتی ہوئی چھوٹی بڑی گلیوں میں بظاہر بے مقصد گھومنے والے فہیم صدیقی کے چہرہ پر صاف پڑھا جا سکتا ہے کہ

نظر میں دھول پرانی رفاقتوں کی لئے
تری گلی سے میں چپ چاپ سا گزرتا ہوا

فہیم صدیقی کی چھیڑی ہوئی یہ کہانی انگریزوں کی گندھارا پر عملداری کی اس نصف صدی کی کہانی ہے جو سرکاری روزنامچوں اور یہاں انگریز حکمرانوں کی یاداشتوں میں خوابیدہ پڑی تھی یہ پشاور کی اس پرکیف اور پراسرار شہر اور وادی کی کہانی ہے جس کے بارے میں مغل شہنشاہ بابر نے اپنی تزک میں لکھا ہے ’’فصل بہار میں پشاور کے نزدیک پھولوں بھرے میدان واقعی جنت نگاہ ہیں‘‘ اور جنگل بک والے معروف نوبل انعام یافتہ شاعر، افسانہ نگار اور صحافی رڈیارڈ کپلنگ کہتے ہیں

’’جب فصلِ گل وسعت صحرا پر محیط ہوتی ہے،
جب صدائے جرس بابِ خیبر کو پار کر لیتی ہے،
جب بوجھ سے لدے اونٹوں کے گھٹنے خمیدہ ہونے لگتے ہیں

جب ہمارے بٹوے خالی اور تھیلے مزید وزنی ہو جاتے ہیں
جب برف آلود تجارت شمال سے نیچے اترتی ہے
تو ایسے میں پشاور کی وادی سامنے کھڑی کھلکھلاتی ہے''

یہ اسی جادوئی وادی کی کہانی ہے جہاں خیبر کے راستے آنے والے کتنے ہی اجنبیوں کو خوش آمدید کہا گیا، مہمان نوازی کی داستانیں رقم کیں قصے سنا سنا کر ان کے دل بہلائے لیکن ان اجنبیوں نے یہاں کے سراپا محبت باسیوں کو اپنی حاکمیت کا سکہ بٹھانے کے لئے طرح طرح سے زیر کرنے کی جو سازشیں کیں چالا کیاں کیں ان باسیوں کی جدوجہد اور مزاحمت کی وہ ساری روداد جانے کہاں کہاں سے تلاش کر کے فہیم صدیقی نے اُسے، ایسا دلکش اور دل کو کہیں بہت اندر سے چھونے والا قصہ بنا دیا جس میں اس فسوں گر وادی پشاور کا گزشتہ کل تجسیم ہو کر پڑھنے والے سے مکالمہ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے، اور سچ یہی ہے کہ فہیم صدیقی نے تاریخ کو ایک ایسا ادب پارہ بنا دیا ہے جس کی فضا اپنے خوبصورت پیرایۂ اظہار، طرز احساس، مسحور کن لفظیات اور دردل پر دستک دینے والے واقعات سے مملو ہے بہت دنوں بعد میں نے اتنی عمدہ تحریر کے ساتھ بہت دل خوش کن وقت گزارا، فہیم صدیقی جی! مجھے مجھ سے ملوانے، اپنے بیتے ہوئے کل کی قابل فخر یادوں کی قلمی تصویریں دکھانے، اپنی آزادی پر کسی طرح کا بھی سمجھوتہ نہ کرنے والے، غلام بنانے والی ساری گھناؤنی سازشوں کے خلاف ڈٹ جانے والے، بہادری اور بے خوفی کی نا قابل فراموش داستانیں رقم کرنے والے کرداروں سے متعارف کروانے اور اپنی حکومت کے سورج کو کبھی غروب ہونے نہ دینے کے دعویداروں کو ناکوں چنے چبوانے والے اس وادی پشاور کے غیور سپوتوں کی

یہ سچی اور بے بدل کہانی بننے ،ترتیب دینے اور آنے والے زمانوں کے لئے محفوظ کرنے پر میں آپ کو محبت بھرا سلام پیش کرتا ہوں، یہ قصہ پڑھ کر میرا اپنے ہی ایک شعر پر اعتبار اور بھی بڑھ گیا ہے۔

راستے رزقِ کشادہ کے بہت ہیں ناصرؔ
کوئی اس شہرِ پشاور سے جدا کیسے ہو

2022 کے پہلے مہینے کی اکیسویں صبح

وادی پشاور، گندھارا
مصنف: فہیم صدیقی

زندگی میں لوگ کچھ ہوتے ہیں بادِ سازگار

تب بہار جاتے جاتے رک گئی تھی، یہ **1988** کا زمانہ تھا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ کسی نے بہار میں آنے کا وعدہ کیا تھا مگر کتنی ہی بہاریں اسی طرح رک رک کے اپنی باری بھر کر چلی جاتیں مگر آنے والا لوٹ کر نہ آیا مگر لگتا تھا کہ اب کہیں جا کے اس کے کانوں میں صوفی تبسم کے شعر نے سرگوشی کی،

تم تو کہتے تھے بہار آئی تو لوٹ آؤں گا
لوٹ آؤ میرے پردیسی بہار آئی ہے

پھر شعر کا جادو چل گیا اور سارے ملک میں اس خبر کی خوشبو پھیل گئی کہ اس اپریل میں سب کا دلدار اور یارِ خوش گفتار و خوش اطوار دلیپ کمار اپنی جنم بھومی پشاور آ رہا ہے، جاتی بہار نے اپنے قافلہ کو ایک بار پھر اکھڑے خیمے لگانے کا حکم دیا، مجھے یقین ہے کہ ایسا نہ بھی ہوتا تو پھر بھی بہار کا سا سماں اس لئے ہوتا کہ دلیپ کمار بلکہ یوسف خان بلکہ پشاوری روزمرہ کے مطابق یوسف جان کے اپنے شہر کے باسی ہمیشہ کہتے ہیں ''باغ دی بہارا اے کہ دل دی بہارا ئے'' اور دل کی کلی یہ خبر سن کر کھل اٹھی تھی۔ میرے لئے یہ خبر دُہری خوشی لے کر آئی ایک تو میرے محبوب فنکار کی پشاور آنے کی خوشی اور دوسری خوشی یہ تھی کہ ایک سہانی صبح میری شفیق دوست ڈاکٹر سیمیں محمود جان میرے گھر نہ صرف یہ خبر لے کر خود آئیں۔ بلکہ مجھے یہ کہہ کر بہت بہت سرشار بھی کر دیا کہ یوسف بھائی پشاور

فاطمید فاؤنڈیشن پشاور کے جس مرکز کے افتتاح کے لئے آ رہے ہیں اس تاریخی تقریب کے میزبان (کمپیئر) آپ ہوں گے۔ ایک لمحے کو تو مجھ جیسے بہت بولنے والے کو چپ سی لگ گئی۔ کیا واقعی خوابوں کو تعبیر بھی مل جاتی ہے؟ میں سوچنے لگا۔۔۔ خیر کمپئرنگ کے اعزاز کے ساتھ ساتھ کچھ نئے احباب سے تعارف اور ملاقاتیں بھی میرے لئے دائمی خوشی کا باعث بن گئیں، فلمسٹار سائرہ بانو، ناظم جیوا، یوسف خان کے چھوٹے بھائی احسن خان (جنہوں نے شو کے فوراً بعد سٹیج پر آ کر میری میزبانی کو سراہتے ہوئے مجھے چائے کی دعوت دی، میں انہیں نہیں جانتا تھا مگر ان کے بے حد اصرار پر میں، رفعتؔ اور چار سالہ افراز علی سیّد پشاور کے اکلوتے پنج ستاری ہوٹل چلے گئے، وہاں جب انہوں نے اپنا تعارف کرایا تو ہم سب کی حالت دیدنی تھی) اور دلیپ کمار کی استقبالیہ کمیٹی کے فعال، محبتی، ہنس مکھ اور خوبصورت 'ٹال' جواں رعنا ایک ڈاکٹر جن کے ماتھے پر دلیپ کمار کی سی ایک لٹ بھی ان کے چہرے کی بلائیں لے رہی تھی ویسے بھی یہ وہ دن تھے جب ہماری آنکھوں میں ایک ہی شبیہہ رکی ہوئی تھی جی ہاں یوسف جان کی شبیہہ۔ پھر ڈاکٹر سیمیں محمود جان نے تعارف کرایا یہ ڈاکٹر ریاض احمد ہیں، یہ ملاقاتیں بس تعارف اور یوسف خان کے پشاور رہنے تک ہی محدود رہیں، بعد کے زمانے میں صرف سیمیںؔ جی سے ملاقاتیں تواتر سے رہیں، لیکن جاتی بہار کا وہ پھیرا دل میں ایسا ترازو رہا کہ کوئی ربع صدی بعد جب ایک شام میرے فون پر ایک محبت بھری آواز نے کہا میں ڈاکٹر ریاض احمد ہوں آپ کو یاد ہوگا جب۔۔۔ میں نے انہیں بات مکمل کرنے کا موقع دیئے بغیر کہا، ڈاکٹر صاحب آپ کہاں ہیں؟ آپ سے تو پھر نشتر ہال کے بعد ملاقات ہی نہیں ہوئی میں تو سمجھا آپ یوسف خان کے ساتھ بمبئی چلے گئے' ہنس کر کہنے لگے میں پشاور میں ہوں اور آپ کی ادبی اور ثقافتی

سرگرمیاں پڑھتا اور دیکھتا رہتا ہوں، پھر کہنے لگے مجھے گلزار جاوید نے آپ سے رابطہ کرنے کا کہا ہے آپ ان کو جانتے ہیں میں نے کہا میں تو بس ایک ہی گلزار جاوید کو جانتا ہوں جس کی ''چہارسو'' گونج ہے، ہنس پڑے جی وہی وہی۔ وہ ''چہارسو'' کا ایک ''قرطاسِ اعزاز'' آپ کے نام کرنا چاہتے ہیں، میں نے کہا اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ میں تو انہیں جانتا ہوں وہ مجھے نہیں جانتے۔۔۔ بھائی اتنے معتبر جریدے میں یہ اعزاز قدآور قلمکاروں کو دیا جاتا ہے اور ''من آنم کہ من دانم''۔ خیر یہ قصہ تو دوست جانتے ہیں، اس فون کے بعد ڈاکٹر ریاض سے ملاقات تو نہ ہو پائی مگر رابطہ استوار ہو گیا، پاکستان میں بھی اور امریکہ میں بھی جہاں وہ میری دعوت پر ڈیلس (ٹیکساس) کے نعتیہ مشاعرے میں آئے تھے۔ معلوم ہوا کہ حضرتِ ریاض احمد ڈاکٹر، تو اقلیم شاعری کے چھپے رستم نکلے جو چہارسو کے گلزار جاوید نے دریافت کئے، ایک بڑے اور مؤقر جریدے میں تواتر سے شائع ہونا بجائے خود ایک اعزاز سے کم نہیں، جس پر رشک ہی کیا جا سکتا ہے، اب کچھ دن پہلے مجھے چہارسو کے انعام الحق کی طرف سے گلزار جاوید کے اس حکم نامہ کے ساتھ ایک مسودہ موصول ہوا کہ چند سطریں اس پر لکھوں تو معلوم ہوا کہ یہ تو ڈاکٹر ریاض کا پہلا شعری مجموعہ ہے، میں تھوڑی سی اداسی اور بہت سی فرصت میں اسے پڑھ کر اس پر چار سطریں لکھنا چاہتا تھا مگر میں ایک مبتلا شخص بے کار کے کاموں میں کولہو کے بیل کی طرح جتا رہا۔ تا وقتیکہ گلزار جاوید کی ناراضی کا دھڑکا سا لگ گیا تو فکر دنیا سے چند لمحے مستعار لے کر چند سطریں لکھنے بیٹھا جو کسی طور ڈاکٹر ریاض کی شعری ریاضت اور فکری منظر نامہ کا تجزیہ اور تبصرہ نہیں کہلائی جا سکتیں، مانو یہ ایک تاثر ہے، میں نے جتنا وقت بھی ریاض احمد کے شعر کے ساتھ گزارا ہے اس نے مجھے کئی حوالوں نے اپنے سحر میں گرفتار رکھا، اور میں دیر دیر تک یہی سوچتا رہا کہ اردو شعر کی

جو عمومی فضا ہمارے ہاں بنتی ہے، جانے انجانے میں ہم نے اسے ایک ہی کھونٹے سے باندھ رکھا ہے، جون ایلیا نے کہا ہے کہ

یہ مجھے چین کیوں نہیں پڑتا
ایک ہی شخص تھا جہان میں کیا

اس شعر میں خود کلامی کا رومینس اپنی جگہ مگر اردو شعر کی دنیا کا حتمی سچ بس یہی ہے، جس کی طرف جون ایلیا نے اشارہ کیا ہے اردو شاعری اُسی ایک شخص کے گرد ہی گھومتی ہے اور شاعر باقی جہاں سے کنارہ کئے رہتا ہے، ادیب سہارنپوری کا بھی مصرع ہے کہ ''چن لیا میں نے تمہیں، سارا جہاں رہنے دیا'' سو ہماری اردو شاعری کی جولان گاہ بس یہی ہے، مگر ڈاکٹر ریاض کا شعری اور فکری منظر نامہ محبت کے جن موسموں سے ترتیب پاتا ہے اس میں ''اُس شخص'' سے زیادہ ذکر ''جہان'' کا ہے جہان جس میں ہمارے کچھ بہت ہی میٹھے اور دل کو کہیں بہت اندر سے چھوتے وہ رشتے سانس لیتے ہیں جنھیں ہم نے جانے کیوں شعر کی قلمرو سے دیس نکالا دیا ہوا ہے، مگر ریاض احمد نے ایسے تمام پوتر اور منزہ رشتوں کو محبت، خلوص اور احترام سے شعر میں برتا ہے، اور ان کے بارے میں برملا کہا ہے

زندگی میں لوگ کچھ ہوتے ہیں بادِ سازگار
پھیل جاتی ہے چمن میں جن سے خوشبوئے بہار

سو اس مجموعہ میں شامل اشعار کا ذائقہ آپ کو قدرے مختلف مگر بہت سچا لگے گا، ہمارے ہاں بہت سے اردو شعرا ایسے ہوتے ہیں جس میں شاعر کا مطالعہ تو جھلک رہا ہوتا ہے، مگر اس میں مذکور خواب کبھی خود شاعر کے لئے واردات نہیں بنے ہوتے، اس کے برعکس

اس مجموعہ کی نظمیں جہاں انسانی رشتوں کے سچے بندھنوں کی کہانی سناتی ہیں وہاں کائنات کے اسرار و رموز کو قرآنی بصیرت کے ساتھ سمجھنے اور سمجھانے کی ایک شعوری کوشش بھی ہیں، سیانے کہتے ہیں کہ آسمان کو چھونے کی خواہش میں بس اتنی احتیاط لازم ہے کہ اپنی زمین سے پاؤں اٹھنے نہ پائیں اور اس شعری مجموعہ میں شاعر نے کہیں بھی خود کو اپنے معروضی حالات سے الگ نہیں رکھا، ان کی رواں دواں نظمیں پڑھنے والے کو نہ صرف ساتھ لے کر چلتی ہیں بلکہ بہت دیر تک خورسند بھی رکھتی ہیں۔ اچھے مصرعے اور شعر ڈاکٹر ریاض کی شعری ریاضت کے گواہ بھی ہیں مگر چپکے چپکے کہہ بھی رہے ہیں کہ شعر کے معبد میں وہ اب زیادہ وقت گزارتے ہوئے اُن، اُن چھوئے اہداف کو حاصل کرنے کی سعی کریں جن کا حصول کسی بھی شاعر کو ''بقائے دوام کے دربار میں'' اعلیٰ نشست کا سزاوار ٹھہراتا ہے۔ میں ان کے شعر لکھنے کی بجائے پڑھنے والوں کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ اس شعری مجموعہ کے کوہ ندا سے آنے والی صدا ''یا اخی۔۔یا اخی'' پر لبیک کہتے ہوئے اس مجموعہ کی سیر کریں جس میں غزل کے عمدہ شعر اور بے ساختہ مصرعے اسی طرح روک روک لیتے ہیں جس طرح 32 برس پہلے کی جاتی ہوئی بہار نے اپنے قافلے کو روک روک لیا تھا۔ اور جس نے مجھے خورسند اور سرشار کر کے کیٹس کا ہمزبان کر دیا تھا کہ ''حسن دائمی مسّرت بخشتا ہے''

راہ نمائے سخن

شاعر: ڈاکٹر ریاض احمد

مرحلۂ شوق

یہ اب جو سماجی رابطہ کی نئی دنیا کے 'شور نے روئے زمیں تمام لیا ہوا ہے' اور ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے اسی نئی دنیا کی زلف کے اسیر ہیں، اسی سے صبحیں اجالتے ہیں اور یہی ہماری اداس شاموں اور رات کی تنہائیوں کی رازدار ہے، اس سے ہمارا وقت ہمارا نہیں رہا اور ہم ہیں کہ دنیا بھر سے اپنے رابطے استوار ہونے پر سرشار ہیں حالانکہ ہمیں بخوبی علم ہے کہ یہ ساری باتیں ہوائی ہوتی ہیں سو فیس بک ہو، انسٹا گرام یا وٹس ایپ اور ٹوئٹر ہو ہم مروتاً یا پھر عادتاً مختلف پوسٹس پر ہلکے پھلکے کمنٹس کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں، ہاں کسی کے اپنے کیسہ میں کوئی تصویر یا تحریر ہو تو وہ بھی ان سائٹس پر سجا دیتا ہے۔لیکن اسی فیس بک نے ایک نیکی کا کام بھی کیا ہے اور ایک ایسی لکھاری خاتون کے کو مہمیز لگا دی ہے کہ جو باوجود اس کے کہ فہمیدہ اختر جیسی صاحب طرز افسانہ نگار کی فرنٹیئر کالج پشاور میں سٹوڈنٹ رہیں اور اسی زمانے سے وہ ادب کی طرفدار بھی ہیں ،تب سے مطالعہ اور اچھے ادب کا مطالعہ بھی ہمزاد کی طرح ان کے ساتھ ساتھ پلتا بڑھتا رہا کالج کے زمانے میں اپنی ادبی رہنما اور آئیڈیل پروفیسر فہمیدہ اختر کے زیر سایہ ادبی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ بھی لیا اور کالج کے زمانے کے اپنی پروفیسر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریروں کو بھی تمام تر محبتوں اور عقیدتوں کے ساتھ سینت سینت کر

سینے سے لگائے رکھا مگر ادب کواوڑھنا بچھونا بنانے کے باوجود صحیح معنوں میں اس وقت تک خود پر منکشف نہ ہوئیں جب تک فیس بک (جسے وہ 'رخ کتاب' کہتی ہیں) کی اس طلسمی دنیا میں وہ داخل نہیں ہوئی تھیں، ادب کی طرح انھیں فطرت اور مظاہر فطرت کے ساتھ ساتھ ڈھارس بندھاتی صبحوں اور کانوں میں سرگوشی کرتی اداس شاموں سے بھی محبت ہے، اس لئے فیس بک پر ان مناظر کی تصاویر کے ساتھ جب ان کے دلربا کیپشن میں ان کی قلبی اور ذہنی کیفیات کا بیاں بھی شامل ہو جاتا ہے تو پڑھنے والا غیر محسوس طریقے سے ان کی ان چندسطری کیفیات کے بیان کا منتظر رہنا شروع کر دیتا ہے، بہت کم تحریریں پڑھنے والے سے اس طرح کی دوستی کر کے اسے اپنا گرویدہ بنانے کے ہنر سے آشنا ہوتی ہیں لیکن مرلی بجاتی یہ تحریریں ایسے ہی ہنر سے مملو تھیں مجھے یاد ہے کہ میں نے ان کی ایسی ہی ایک من موہنی تحریر فیس بک سے اٹھا کر اپنے ادبی صفحہ 'ادب سرائے' میں لگادی تھی جوان کے لئے سرشاری کا باعث بنی۔ میں بہت اچھی لکھاری نصرت نسیم کی بات کر رہا ہوں فیس بک کی دنیا نے جن کے قلم کو ایسی روانی اور اعتبار دیا کہ بہت کم عرصہ میں یکے بعد دیگرے دو ایسی کتابیں 'کہکشاں میرے خوابوں کی' اور 'بیتے ہوئے کچھ دن ایسے ہیں شائع ہوئیں جس نے ان کے ادبی قد کاٹھ اور کلاس کا تعین بھی کیا اور مقبولیت میں اضافہ بھی کیا، لیکن ان کا قلم اس موڑ پر رکا نہیں اور وبا کے دنوں کی قید تنہائی میں بھی انہوں نے قلم کے ساتھ دوستی نہیں چھوڑی اور روز مرہ کی کیفیات کو ڈائری کے سپرد کرتی رہیں فیس بک کی دنیا میں ان کے ڈائری کے اوراق نے ان کے پڑھنے اور چاہنے والوں کا ایک بہت بڑا حلقہ بنا دیا، جس میں ادب کی دنیا کے معتبر اور مستند لکھاری بھی شامل ہو گئے، اور از راہ ممنونیت ان زعما کی

کتب پر اپنی محبت اور عقیدت بھری رائے دینا شروع کیا تو یہ راز بھی دوسروں کی طرح خود ان پر بھی کھلا کہ ان کے اندر تو ایک بہت ہی متوازن اور صائب الرائے نقاد چھپی ہوئی ہے، وہ خود کو نقاد کہتیں نہ سمجھتیں ہے بلکہ اپنی پسندیدہ کتب پر ہلکا پھلکا تبصرہ در اصل ان کو ملنے والے کتب کی ایک طرح سے رسید ہوتی ہے کہ ملنے والی کتاب میں نے پڑھ لی ہے۔ حالانکہ فی زمانہ نہ کوئی کتاب ملنے کی رسید دیتا ہے نہ ہی پڑھنے کی زحمت گوارا کرتا ہے، لیکن فیس بک کی حکمرانی کے زمانے میں اب عشق، مشک کی طرح ٹیلنٹ بھی لکانے چھپانے سے چھپتا نہیں سو یہ تبصرے اہل علم وادب کو ایسے بھائے کہ مقبول ادبی جریدوں نے بھی ان سے رابطہ کر کے ان کو تبصرہ کے لئے کتب بھیجنا شروع کر دیں، اس سے انہیں دہرا فائدہ ہوا ایک تو یہ کہ ان کو مطالعہ کے لئے عمدہ کتب میسر آ گئیں اور پھر لکھنے کی تحریک بھی مل گئی، اور مطالعہ اور لکھنا دونوں ہی ان کے پیشنز ہیں، ابھی ایک کتاب اشاعت کے مراحل میں ہے اور ان تبصروں پر مبنی ان کی یہ دوسری کتاب بھی پریس میں جانے کو تیار ہے۔ میں اس پڑاؤ پر انہیں علامہ اقبال کی زبان میں صرف اتنی ہی دعا دے سکتا ہوں کہ۔۔

اللہ کرے مرحلۂ نہ ہو طے

حاشیۂ خیال
مصنفہ: نصرت نسیم

دشتِ امکان کے غبار میں گم حسام حرؔ

بہت دیر تک میں حسام حر کے لکھے ہوئے ان قصیدوں کی وادی میں پھرتا رہا اور اپنی سانسوں کو ان کی خوشبو سے معطر کرتا رہا۔ یارو! یہ عشق بھی ایک عجیب معمہ ہے۔ کسی کو بھی اپنی اک چھب دکھا کے چھپ جاتا ہے۔ پھر باقی کی تمام عمر کا سفر، تلاش اور جستجو کا ہوتا ہے گویا جانے انجانے راستوں پر انسان کبھی اس عشق کو اور کبھی اپنے آپ کو آوازیں دے دے کے امکانات کے صحراؤں میں راستہ ڈھونڈھتا پھرتا ہے۔ (میں میرؔ میرؔ کر اس کو بہت پکار رہا)

اور پھر یہی اڈیکاں عشق کے دشت امکان کی بھول بھلیوں میں گشت کرنے والوں کا نصیبہ بن جاتی ہیں۔ اور اس کے بعد کا پھر سارا معاملہ اور ساری نگرانی کا ذمّہ توفیق اپنے ہاتھوں میں لے لیتی ہے۔ پھر یوں ہوتا ہے کہ کوئی کوئی تو دشتِ امکان کی ان بھول بھلیوں سے کچھ ہاتھ پیر مار کر باہر نکل آتا ہے اور بزعم خود اپنے آپ کو سرخرو بھی سمجھنے لگتا ہے۔ (ہم لوگ سرخ رو ہیں کہ منزل سے آئے ہیں۔ فیضؔ)۔ لیکن یہ سوچ اور یہ قصہ کم پانی میں ڈوبنے والوں اور پیروں تلے زمین دیکھنے والوں کا ہے۔ لیکن اس کے برعکس کوئی اس دشت امکان کے غبار میں گم ہو کے اپنے آپ سے بھی بے خبر اور بیگانہ ہو جاتا ہے۔ اپنے آپ سے بیگانہ ہونا ہی دراصل محبوب کے آگے سرینڈر

ہوجانے کا دوسرا نام ہے۔ اس مرحلے تک پہنچ کر پھر یہ منتخب اور چنے ہوئے لوگ محبوب کی طرف جانے والے راستے پر دیوانہ وار چل پڑتے ہیں۔ یہ وہی راستہ ہے جس پر چلتے ہوئے جنید و بایزید سانس روک لیتے ہیں، فریدالدین کے نقش قدم پر چلتے ہوئے جلال الدین بھی جانے انجانے میں دیکھی ان دیکھی وادیوں کی طرف نکل جاتا ہے اور خدائے سخن کو کہنا پڑتا ہے۔ دور بیٹھا غبار میرؔ اس سے۔۔اور یہ سارے راستے اوران پر چلنے والے سارے منتخب قدآور لوکوں کے پیش نظر اصل میں اس نظر کرم اوراس خصوصی توجہ کی طلب ہے۔ وہی توجہ اور شرف قبولیت جس نے امام شرف الدین بوصیریؒ کو ایک تحفۂ خاص سے نوازا اور اس کے قصیدے کو ہمیشگی عطا کر دی ہے۔اور اسی راستے نے حسام حرکو بھی اپنی طرف راغب کیا ہوا ہے۔ اس واسطے وہ مسلسل اپنے آپ کو مدحت کے نور سے شرابور کرنے کی کوششوں میں لگا ہوا ہے۔ ان قصیدوں کے برتنے میں ایک فطری بہاؤ ہے جو پڑھنے والے کو بھی اپنے ساتھ بہا لے جاتا ہے اور کہیں بھی ردیف قافیہ اس کے خیالات میں کھنڈت کی وجہ نہیں بنتے۔ بلکہ یوں لگتا ہے جیسے مضامین ہی نہیں لفظیات بھی غیب ہی سے خیال میں آ رہی ہیں جن کو بڑی سہولت کے ساتھ حسام حر کاغذ پر منتقل کر دیتا ہے۔ اپنے قاری سے آسانی کے ساتھ دوستی کرتی ہوئی مدحتِ سرکار ﷺ کی پاکیزہ اور محبتوں میں بھیگی ہوئی فضا حسامؔ حر نے کچھ اس طرح سجائی ہوئی ہے جو حرف حرف مشام جاں کو معطر ہی نہیں کرتی بلکہ دل کی بے ترتیب دھڑکنوں واسطے بھی سکون اور راحت کا باعث بنتی ہے۔ گرد و پیش سانس لیتی شکست و ریخت کا شکار اس دنیا اور کائنات کے سمٹتے بکھرتے فاصلوں کو 'وجہ تخلیق کائنات' کی محبت کی چھاؤں میں توازن دینے کی ایک بھرپور تخلیقی

کوشش ہے۔

لیکن اس بات پر مکمل یقین رکھنے کے بعد مجھے یہ خیال بھی آتا ہے کہ یہ سودا ودیعت کے بغیر نہیں حاصل کیا جا سکتا۔ ودیعت کی توفیق ان کو عطا ہوتی ہے جن کی ریاضتیں در قبولیت پر دستک دینے میں سپھل ہو جاتی ہیں۔ تو پھر حسام حر کو اب تک حاضری کی اجازت کیوں نہیں۔ کچھ کچھ کہانی سمجھ آنے لگی ہے۔ میں نے کہا ہے ناں کہ عشق کسی کو بھی اپنی ایک چھب دکھا کر چھپ جاتا ہے پھر باقی کی تمام عمر کا سفر، تلاش اور جستجو کا ہوتا ہے اور یہ تلاش و جستجو آتش کو خوب ہوا دیتی ہے۔ اور اس کا اپنا ایک لطف اور مزا ہے۔ یوں بھی بقول اقبال یہ ساری کائنات اور اس کا ذرہ ذرہ یا تو آفتابِ مصطفوی ﷺ کے نور کا پرتو ہے یا پھر ابھی تک اس کی تلاش اور جستجو میں مگن ہے۔ ابھی حسام حر کو مدحت سرکار ﷺ کا مبارک کام سپرد ہے۔ لیکن میری دعا ہے کہ بہت جلد یہ قصیدے دربار نبوی ﷺ میں پیش کرنے کی سعادت اسے نصیب ہو جاوے اور وہ ان قصیدوں سمیت آقا ﷺ کے سلام واسطے مدینہ حاضر ہو جاوے۔ آمین۔

(پس نوشت۔ قصائد کی اس کتاب کی اشاعت کے کچھ عرصہ بعد ان کو بلاوا آ گیا تھا)

پشاور۔ 2022 کے پہلے مہینے کی تیسری شام

پانچ قصیدے

شاعر: حسام حر

پورے ادھورے خوابوں کی روشن تعبیریں

اور اب مجھے اس بات کا قلق ہے کہ میں نے اپنی بے معنی سی مجلسی مصروفیات میں الجھ کر اتنے دن تک اتنی سوہنی اور من موہنی تحریروں سے اپنے آپ کو کیوں دور رکھا۔ مجھے کچھ کچھ اندازہ تو تھا کہ نصرت نسیم جی کی تحریر کی تاثیر تا دیر اپنا گرویدہ بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ مگر میں اپنی اس عادت کا کیا کروں کہ مجھے جس کتاب پر دو سطریں بھی لکھنا ہوتی ہیں اسے پڑھنا میں اس خیال سے مؤخر کرتا رہتا ہوں کہ جب اتنا وقت میسر آ جائے کہ ایک ہی نشست میں اسے پوری توجہ سے پڑھ بھی سکوں اور پھر اسی کیفیت میں اپنی رائے کا اظہار کر سکوں تو اس کو چھوؤں۔ جس کا نتیجہ اکثر یہی نکلتا ہے کہ میز پر پڑی ہوئی کتابوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے اور میں وقت کے بھاگتے گھوڑے کو قابو کر کے اس کے ایالوں میں ہاتھ پھیرنے کے لئے ترس جاتا ہوں۔ اور اب تو صورت حال اور بھی گھمبیر ہو گئی ہے کیونکہ اب 'قوم نے ڈھونڈ لی فلاح کی راہ' یعنی اب، احباب مسودے ان پیج اور پی ڈی ایف میں بھیج دیتے ہیں، اور سب جانتے ہیں کہ کمپیوٹر کے اپنے سو بکھیڑے ہوتے ہیں، جونہی کھولیں تو گویا ایک جہاں کھل جاتا ہے، آپ کچھ بھی پڑھ رہے ہوں یا لکھ رہے ہوں ساتھ ساتھ سوشل میڈیا کی نوٹیفیکیشنز بھی سکرین پر جل بجھ کرنے لگتی ہیں، آپ لاکھ نظر چرائیں یا ذہن جھٹکیں، کوئی

نوٹیفیکیشن مجبور کر دیتا ہے کہ پہلے اُسے دیکھا جائے۔ اور جو ایک بار پڑھنے یا لکھنے سے ہٹیں تو واپسی کا سفر جان جوکھم کا کام ہوتا ہے، اس لئے اب میں تو مطلوبہ فائل کھول کر نیٹ بند کر دیتا ہوں تو قدرے سکون سے پڑھ یا لکھ پاتا ہوں۔ مجھے جب نصرت نسیم جی کا مسودہ پی ڈی ایف کی شکل میں ملا تو فوراً اسے نہیں کھولا، سوچتا رہا کہ جب بھی تھوڑا وقت اور بہت سی اداسی میسر آئے گی تو پڑھ لوں گا حالانکہ مجھے علم تھا کہ یہ نصرت نسیم کے خوابوں کی کہکشاں ہے اور ہر ستارہ الگ الگ بھی دیکھا جا سکتا ہے، وقفوں سے بھی پڑھا جا سکتا ہے مگر پھر بھی خواہش یہی تھی کہ اِن سارے ستاروں کو کہکشاں کی صورت ہی دیکھوں، اور آج جو اس کہکشاں کی سیر کو نکلا تو مسلسل یہ خیال کچوکے دیتا رہا کہ ''میں نے اپنی بے معنی سی مجلسی مصروفیات میں الجھ کر اتنے دن تک اتنی سوہنی اور من موہنی تحریروں سے اپنے آپ کو کیوں دور رکھا'' یہ خواب جو اس کہکشاں میں جگر جگر کر رہے ہیں مانو یہ مضامین نہیں تصویریں ہیں اور یہ مجموعہ ایک ایسا دلبر و دلربا البم ہے جس میں تصویریں ہی نہیں نصرت نسیم کے بہت سے پورے ادھورے خوابوں کی تعبیریں بھی ہیں اور ایسی کہ ورق ورق ''کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا است'' کی صورت روک روک لیتا ہے۔ میں جو ایک بار اس کہکشاں کے مدار میں داخل ہوا تو پھر جیسے سحر زدہ سا گھومتا رہا، میں اکثر کہتا ہوں کہ مجھے وہ لکھاری بہت متاثر کرتا ہے جو متاثر کرنے کی کوشش نہیں کرتا، سیدھے سبھاؤ من کی بتیوں کو کاغذ کا ہمراز بنا لیتا ہے، اور اسی طرح پھر وہ تحریر وجود میں آتی ہے جو پڑھنے والوں سے سرگوشیاں کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے اور آپ جانیں کہ سرگوشیاں محبتوں کی دین ہوتی ہیں محبّ اور محبوب کی ملاقاتوں کا نصیبہ ہوا کرتی ہیں۔ اور یہ سرگوشیاں غیر محسوس طریقے سے دلوں کے مابین رشتے استوا

رکر لیتی ہیں، من تو شدم تو من شدی کا ذائقہ چکھا دیتی ہیں، سو نصرت نسیم جی کے ان خوابوں کی اس کہکشاں سے رومینس کئے بغیر میں بھی نہ رہ سکا، جس خلوص اور محبت سے نصرت نسیم کا قلم جادو جگاتا ہے اس کے سحر سے ویسے بھی بچ نکلنا ممکن ہی نہیں اس لئے میں بھی سحرزدہ سا خواب نگر کی گلیوں میں ان کے ہمراہ ان کے ہمزاد کی طرح پھرنے لگا یعنی جہاں جہاں وہ ہنستی ہیں، میں بھی ساتھ ہنستا چلا جاتا ہوں، جہاں جہاں وہ افسردہ ہوتی ہیں اپنی اداسی کو پکارنے لگتا ہوں، اور جب ان کی آنکھوں میں بیتے ہوئے زمانے دھواں بھرنے لگتے ہیں تو میری ہچکیاں بندھ جاتی ہیں کہ ایسی ہی جان لیوا یادوں سے میرا دل بھی بھرا ہوا ہے، کھوئے ہوئے لمحوں اور بچھڑے ہوئے چہروں کی یادوں سے میرا حلق بھی نمکین ہوتا رہتا ہے اور میرے دل میں بھی کھارے پانی کا سمندر میری آنکھوں کی سمت اپنی لہریں اچھالنے لگتا ہے۔ میں نصرت نسیم کے خوابوں کی کہکشاں سے گزرتے ہوئے مسلسل سوچتا رہا ہوں کہ نہ جانے نصرت نسیم جی کو کس کی دعا سے یہ معجزاتی فن عطا ہوا ہے کہ قاری ایک لحہ کو بھی ان سے اپنی انگلی نہیں چھڑا سکتا، بلا کی رواں دواں تحریر کہیں بھی کسی بات واقعہ یا کسی زبردستی سے کھپائے ہوئے لفظ سے بوجھل نہیں ہوتی۔ یوں تو ساری کہکشاں دل کے علاقے کو گنگناتی ندی کی طرح سیراب کرتی جاتی ہے مگر اس وقت دل کو کہیں بہت اندر سے چھوتی اور شرابور کر دیتی ہے جب ان کے ترسے ہوئے خوابوں کو حجاز مقدس کی اور اذن سفر کی صورت تعبیر مل جاتی ہے۔ جہاں پہنچ کر وہ جس تقدس بھری فضا میں خود کو پاتی اور اپنی قسمت پر عجز کے ساتھ ناز کرتی ہے اوان لمحوں کے دوران اپنی ذہنی اور قلبی کیفیات کی روداد جب نصرت نسیم جی پوری روحانی پاکیزگی کے ساتھ اور آنسوؤں سے دھلے ہوئے شفاف

اور منزّہ لفظوں کے ذریعے کاغذ کے سپرد کرتی ہے تو سچ کہتا ہوں مجھ پر تو ایک رقّت سی طاری ہو گئی تھی اور ایسے میں دل سے اٹھنے والی ہوک نے عبدالرحمٰن جامی علیہ رحمتہ کی اس دعا کا روپ دھار لیا تھا۔۔۔۔

توئی سلطانِ عالم یا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
ز روئے لطف سوئے من نظر کن
مشرف گر چہ شد جامیؔ ز لطفت
خدایا ایں کرم بارِ دگر کن

نصرت نسیم جی نے 'جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے' کا علم اٹھا کر اپنی یادوں اور یاداشتوں کی امانت کو پوری دیانت داری اور محبت کے ساتھ اپنے پڑھنے والوں تک پہنچانے کی سعی کی ہے اس سے ان کی تحریر ایک سچے شعر کی طرح 'از دل خیزد بر دل ریزد' کی حامل بن گئی ہے اور اسی سے میرا یہ احساس ہویدا ہوا ہے کہ ''میں نے اپنی بے معنی سی مجلسی مصروفیات میں الجھ کر اتنے دن تک اتنی سوہنی اور من موہنی تحریر سے اپنے آپ کو کیوں دور رکھا۔'' مگر آپ دیر مت کیجئے گا۔ خوابوں کی کہکشاں کا دلکش ''مونتاج'' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ بسم اللہ۔۔۔۔۔

2020 کے تیسرے مہینے کی 9ویں صبح

کہکشاں ہے یہ میرے خوابوں کی
مصنفہ: نصرت نسیم

لذتِ زندگی۔مبارکباد

عارف افضال عثمانی جی! آپ کو یاد ہے نا؟ کہ گزشتہ کل غالبؔ نے کہا تھا کہ

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

لیکن غالب یہ کہتے ہوئے اس لئے حق بجانب تھے کہ وہ کلکتہ سے ہو آئے تھے، مگر میں تو 'غرناطہ' کبھی نہیں گیا، تو پھر آپ کی یہ سفری کہانی ''قرطبہ اداس ہے'' پڑھتے ہوئے مجھے ایسا کیوں لگا جیسے ایک نہیں کئی ایک تیر میرے جگر میں مسلسل پیوست ہو رہے ہیں اور قدم قدم پر آنکھوں میں دھواں بھرتا جا رہا ہے، لیکن رکئے! جب میں یہ کہتا ہوں کہ میں غرناطہ کبھی نہیں گیا تو شاید یہ پورا سچ نہیں ہے، غرناطہ تو میں کئی بار جا چکا ہوں، جانے کتنی صدیوں سے جا رہا ہوں، یہ غرناطہ تو میرا حافظہ ہے ذرا کہیں ذکر چھڑا تو پورا بدن ایک سُر کی ہوئی ستار کی طرح درد بھرے نغمے اگلنے کے لئے بے تاب ہو جاتا ہے، اور تب میں خود کو ان محلّات کی تعمیر کے زمانے میں کسی ایسے مزدور کے روپ میں دیکھنے لگتا ہوں جو تھکن اتارنے کے لئے کشتی والوں کی طرح اس وقت تک گاتا رہتا ہے جب تک محلات کے ماتھے پر ''لا غالب الا اللہ'' کا کلمہ نہیں لکھا جاتا۔ آپ کی سفری کہانی پڑھتے ہوئے مجھے لگا کہ میں بھی آپ کے ساتھ ساتھ الحمرا کے حسن سے خود کو

شرابور کر رہا ہوں، عظمتِ رفتہ سے خود کو بھگو رہا ہوں زرد اور نارنجی رنگ کے مالٹوں لیموؤں اور سنگتروں کی چھاؤں چھاؤں چلتا ہوا اس زمانے میں پہنچ جاتا ہوں جب غرناطہ کی مساجد سے بلند ہونے والی اللہ اکبر کی پرشوکت آواز سارے میں گونجتی تھی۔اب آپ سے کیا پردہ، پہلی بار ایک لعبتِ پشاور کا ہاتھ پکڑتے ہوئے میں نے سرگوشی میں اُسے کہا تھا ''ہسپانوی لیموں کی سی رنگت والی اے لڑکی، تُو مجھے بہت اچھی لگتی ہے'' جب آپ نے مالٹوں اور سنگتروں کے ساتھ ہسپانوی لیموؤں کی بات کی تو میں اپنی کٹھی میٹھی محبتوں کے زمانوں کی ساری سرشاری سمیت آپ کے ساتھ ہی ہولیا تھا۔اسی طرح جب آپ نے سفری کہانی کا رخ امریکہ کی طرف موڑ کر 'کولمبس کا شکریہ' ادا کیا اور اس کی دریافت ''امریکہ'' کو انسانیت اور محبت کی سرزمین کہتے ہوئے اِسے رہنے کے لئے ایک بہترین ملک قرار دیا، تو مجھے بہت اچھا لگا کیونکہ آج کا فیشن تو اس سرزمین سے فائدہ بھی اٹھانا ہے اور منہ اٹھا کر اس کو برا بھلا بھی کہنا ہے ایک بلا کے محبتی اور سچ کی طاقت پر یقین رکھنے والے دوست نے یہ لکھ کر میرے ذہن سے ایک بڑا بوجھ اتار دیا ہے کیونکہ میرے جگر کا ٹکڑا افراز علی سیّد بھی اسی سرزمینِ محبت میں رہتا ہے اور طالع آزما منچلوں کی باتیں سن کر مجھے لگتا تھا کہ شاید میرا یہ فیصلہ زیادہ درست نہیں، مگر اب نہیں سو آپ بے شک کولمبس کا شکریہ ادا کریں میں تو کہوں گا عارف افضال جی! آپ کا شکریہ۔ لگے ہاتھوں اپنے بارے میں ایک راز کی بات بھی آپ کو بتاؤں کہ ''مجھے وہ لکھنے والا بے حد متاثر کرتا ہے جو لکھتے ہوئے متاثر کرنے کی قطعاً کوشش نہیں کرتا۔'' عثمانی جی یہ جو آپ سادہ سادہ چھوٹے چھوٹے فقروں میں کہانی کو آگے بڑھاتے ہوئے سفر کی جزئیات بیان کر رہے ہوتے ہیں نا، یقین مانیں یہ میرے دل کو کہیں بہت اندر سے چھوتے ہیں، آپ

کی تحریر میں جو ایک پیار اور دلار سا ہے ایک اپنائیت سی ہے وہ آپ کی نثر کو لطافت بلکہ شعر کی سی غنائیت بخشتا ہے جو پڑھنے والے کو غیر محسوس طور پر آپ کا ہمزاد بنا دیتا ہے، اور پھر پڑھنے والا آپ کی ساری قلبی اور ذہنی کیفیتوں میں شریک ہو جاتا ہے گویا وہ آپ کے ساتھ ہی سوتا جاگتا، دوڑتا پھرتا، ہنستا روتا اور سکھی دکھی ہوتا رہتا ہے۔ عثمانی جی آپ کو پتا ہے جب بچپن میں رات کے وقت والدہ مرحومہ کہانی سناتیں تو آنکھیں نیند سے بوجھل ہو جاتیں۔ مگر کہانی میں (یا شاید کہانی سے) میری دلچسپی مجھے سونے سے روکے رکھتی اور کبھی اسی عالم میں سو بھی جاتا تو نیند میں خود کو کہانی والی پریوں کے باغات اور محلات میں پاتا اور یوں والدہ سے سنی ہوئی کہانی جب زندہ اور سانس لیتی نظر آنے لگتی تو ایک بے بدل سی سرخوشی اور وارفتگی مجھے جاگنے کے بعد بھی گھیرے رکھتی تھی۔ اب بہت زمانوں کے بعد آپ کی اس سفری کہانی نے ایک بار پھر مجھے ٹائم مشین میں بٹھا کر اندلس کے ان ساحلوں پر پہنچا دیا، جب سانس لیتی کہانی کی ساعتوں میں پہلی بار یہ آواز گونجی تھی۔ کشتی والو سب کشتیاں جلا دو۔ معذرت کے ساتھ کہ جب آپ نے جبل الطارق جانے کو مؤخر کر دیا، مگر اس ارادے کی ایسی دلنشیں لفظی تصویریں بنائیں کہ میں آپ سے انگلی چھڑا کر وہاں تک بھاگتا چلا گیا۔ بس کیا بتاؤں کہ آپ کی یہ سفری کہانی مجھے اپنے بازوؤں میں بھر کر کن زمینوں آسمانوں اور جہانوں میں لئے لئے پھرتی رہی، اور اب میں اپنے تئیں محض اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ یہ جو آپ کا ارادہ دوبارہ جانے کا ہے نا، تو اب کے میں آپ کے ساتھ جاؤں گا اور وہاں موجود کسی بھی سیکورٹی گارڈ کی پروا کئے بغیر جہاں جہاں ہمارا دل چاہے گا ہم قادرِ مطلق کے آگے جھک جائیں گے اسے سجدہ کریں گے۔ اور یاس یگانہ چنگیزی کے شعر کے پہلے مصرع، لذت زندگی مبارکباد،

میں ''زندگی'' کے لفظ کو ''بندگی'' سے بدل کر یہاں وہاں بہ آوازِ بلند اک دوجے سے کہیں گے۔

لذت 'بندگی' مبارکباد
کل کی کیا فکر؟ ہر چہ بادا باد

قرطبہ اداس ہے
مصنف: عارف افضال عثمانی

نوید ملک کی کامنی

ادب کی دنیا میں نئی قدروں اور جہتوں کا تعین حتمی طور پر کرنا ممکن نہیں۔ تاہم روایت کے تسلسل اور تواتر میں جب بدلتی ہوئی حسیات کی دھند چھٹتی ہے تو کچھ نکھری نکھری قدریں یہ کہہ کر دامن کھینچتی ہیں کہ جا اینجاست یہ اقدار اجتماعی شعور کا حصہ بھی ہوسکتی ہیں اور انفرادی تجربات کا حاصل بھی ہوسکتی ہیں۔ میں جب اپنے عہد کے جواں فکر دوستوں کا شعر پڑھتا ہوں تو ایک گونہ حیرت ہوتی ہے کہ سفر کے پہلے پڑاؤ پر بھی ان کے لب ولہجہ میں بلا کا اعتماد ہوتا ہے، میں اس اعتماد کی بات کر رہا ہوں جو بہت دور تک کی اس دشت کی سیاحی کرنے والوں کو بھی کم کم نصیب ہوتا ہے۔ مان لو جتنا اچھا شعر اب کے جواں سال و جواں فکر شعراء کے پاس ہے وہ بہت سے کہنہ مشق شعراء کو کمپلیکس میں مبتلا کرنے کے لئے کافی ہے۔ نوید ملک اسی تازہ کارکھیپ میں ایک تازہ دم سخنور ہے جس کا ایک شعری مجموعہ قلم قبیلے سے پزیرائی حاصل کر چکا ہے۔ اب کے وہ اپنے پڑھنے والوں کے لئے کامنی لایا ہے۔ کامنی نوید ملک کی نظموں کا اکٹھ ہے مگر جو میں اس کی سیر کو نکلا تو مجھے اس کی تازگی کا احساس ہوا جو صبحدم سیر چمن پر نکلے ہوا خواہ کو نصیب ہوتی ہے۔ مجھے کامنی نوید ملک کی ذاتی ڈائری لگی۔ جو وہ اپنے احباب سے شیئر کرنے جا رہا ہے۔ یہ اس طرح سے نوید ملک کے اندر کی دنیا کا پروفائیل ہے۔ اس کی محبتوں، نفرتوں' پسند ناپسند، زندگی کے کمزور و توانا لمحوں کی داستان ہے۔ مگر یہ سب

اتنے خلوص، محبت اور اپنائیت سے شیئر کیا جا رہا ہے کہ آپ اس کے ساتھ ہی ہنستے اور روتے ہیں۔ آپ کو اس کی گلی کی طرف سے آتا ہوا بارش کا پانی معطر لگتا ہے شاید اس نے باہر پانی میں قدم رکھ دیا۔ چیک سے آپ کو اپنا اکاؤنٹ یاد آ جاتا ہے جواب تک کسی کی اپروول کا منتظر ہے۔ اور روداد تو آپ کو چپ کرا دینے والی نظم ہے۔ جسے پڑھتے ہوئے آپ تینوں حیثیتوں کا مزہ چکھتے ہیں۔ جنھیں باپ بیٹا اور دادا کہتے ہیں۔ یہ دنیا ایک لڑکی ہے۔ آخری بارش، چار موسم، کامنی، کھوجنا ضروری ہے۔ اور کئی ایک نظمیں ہیں جو پل کے پل آپ کو نوید ملک کا ہمزاد بنا دیتی ہیں۔ اگر ادب واقعی کسی ایک ذہنی کیفیت سے دوسری میں منتقل ہونے سے عبارت ہے تو کامنی سے پڑنے والی دوستی کو قائم ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ معلوم نہیں آپ کس حد تک مجھ سے متفق ہونگے کہ کم لفظوں میں اور ادھورے اظہاریے میں کچھ اپنی طرف سے شامل کر کے قاری تخلیق سے پورا پورا لطف لیتے ہوئے شاعر کی واردات میں برابر کا شریک ہو جاتا ہے۔ اور اگر ایسا ہی ہے تو کامنی کی ننھی منی نظمیں بڑی کہانی سناتی ہیں۔ آپ یہ تجربہ کیجئے اور میں کامنی کے اس شعر کی سفاک معنویت کے سحر سے نکلنے کی کوشش کرتا ہوں۔

نہ جانے کون سا اب غم ملے گا
بہت عرصہ ہوا رویا نہیں ہوں

(مئی ۲۰۱۳ کی ۲۰ ویں صبح)

کامنی

شاعر: نوید ملک

کالم کہانی

ادبی دنیا سے علاقہ رکھنے والے کچھ دوستوں نے یہ جو کالم لکھنے کا روگ پال رکھا ہے ان کو اس کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ انہیں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو فعال رکھنے کے لئے 'نیٹ پریکٹس' کا موقع مل جاتا ہے، اس پر اضافی اطمینان یہ بھی حاصل ہوتا ہے، کہ وہ اپنی بات اپنے لوگوں تک سہولت سے پہنچا رہے ہیں، مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک نقصان بھی ہے کہ کالم لکھنے سے تخلیق کار کے اندر کا جوار بھاٹا پرسکون ہو جاتا ہے اور کتھارسس پورا ہو جائے تو راہ سخن کی طرف قلم اور قدم نہیں اٹھتے۔ احمد فراز نے روزنامہ اوصاف میں بہت اصرار کے بعد کالم شروع کیا لیکن غالباً دو چار کالموں کے بعد ہی تائب ہو گئے اور ان چار کالموں میں بھی دو ایک میں نظمیں تھیں، انہوں نے پروین شاکر کو بھی کالم لکھنے سے منع کیا تھا۔ غالباً یہ بات قلم قبیلے کے ان دوستوں پر زیادہ صادق آتی ہے جو روزانہ کالم لکھتے ہیں اور شعر و ادب کے لئے ان کا جوش و خروش بہت کم رہ جاتا ہے اور کالم کی زندگی محض ایک دن کی ہوتی ہے۔، البتہ اگر کچھ منتخب کالموں کو کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے اور ان میں ایسے موضوعات بھی ہوں جو دیرپا اہمیت کے حامل ہوں تو یقیناً یہ لکھنے والے کو آنے والے زمانے کے لئے بھی قابل قبول اور تر و تازہ رکھ سکتے ہیں۔ موضوعات کا انتخاب اس لئے بھی ضروری ہے کہ مجھے یاد ہے کہ کالموں کے ایک

مجموعے کی اشاعت کے بعد فکاہیہ کالم نگار دوست اکرام اللہ مہمند نے کہا تھا۔ یہ کالم تو ایک بار بھی پڑھنے کے نہ تھے جانے موصوف نے کیا سوچ کر انہیں کتابی شکل دے دی۔ اور وہی ہوا کہ وہ مجموعہ چھپتے ہی چھُپ گیا تھا۔

ہندکو زبان کی بہت ہی عمدہ اور پشاوری تہذیب میں گندھے ہوئے شعر کہنے والی رانی بانو جس نے بہت کم مدت میں اپنے دو خوبصورت شعری مجموعے اپنے پڑھنے والوں کو دیئے، شاعری انہوں نے احمد علی سائیں کو پڑھ کر شروع کی تھی۔ پھر مختلف اخبارات میں ان کے کالم بھی شائع ہونے شروع ہوئے، یقیناً کالم نگاری انہوں نے اپنے شریک حیات پروفیسر صبیح احمد کے کالم پڑھ کر شروع کی ہوگی۔ ایسی خواتین کالم نگار کی تعداد کچھ زیادہ نہیں جو شعر و سخن سے بھی جڑی ہوئی ہوں، شعر و سخن کے حوالے سے تانیثی ادب پر تو لمبی بات کی جا سکتی ہے، کہ اس شعبہ میں بڑی حد تک ثروت مند ہے مگر کالم نگاری کی فیلڈ میں پاکستان میں تو خیر خواتین کالم نگار بہت ہیں مگر خیبر پختونخوا کی حد تک کچھ اچھی خبر میرے پاس نہیں ہے۔ اس لئے رانی بانو کے کالم بڑی حد تک غنیمت ہیں۔ میں ان کے کالموں کو مسلسل تو فالو نہیں کر پایا کہ رانی بانو کی مہم جو طبیعت اسے کسی ایک اخبار تک محدود نہیں رہنے دیتی، اس لئے مجھے خوشی ہوئی کہ اب انہوں نے اپنے کچھ منتخب کالموں کو یکجا کر کے محفوظ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں حتمی طور پر تو نہیں کہہ سکتا کہ ان کے کالموں کا عمومی موضوع کیا رہتا ہے مگر اس انتخاب کے مطالعہ کے دوران مجھے رہ رہ کر خیال آتا رہا ہے کہ رانی بانو تانیثی موضوعات کے اطراف ہی میں رہنا پسند کرتی ہیں، دراصل یہ وہی موضوعات ہیں جنہیں وہ کمال مہارت سے اپنی ہندکو شاعری میں بھی برتتی رہتی ہیں، انہوں نے بجا طور پر اپنے

کالموں کے اس انتخاب کا نام ''عورت اور پانچواں موسم'' رکھا ہے کیونکہ دنیا کے جس حصّے میں ہم سانس لے رہے ہیں باقی دنیا کی نسبت یہاں کی عورت کو بہت سی پابندیوں میں زندہ رہنا پڑ رہا ہے ویسے تو کہا جاتا ہے کہ عورت کا کوئی گھر نہیں ہوتا، پہلے وہ ماں باپ کے گھر میں رہتی ہے پھر شوہر کے گھر چلی جاتی ہے، عمر کے آخری حصّے میں وہ بچوں کے گھروں میں رلتی ہے، یا پھر واپس بھائیوں کے گھر آ جاتی ہے۔ عورت کی سمجھوتہ بھری زندگی کے لئے رانی بانو کی دلسوزی ان کی تحریروں میں آسانی سے محسوس کی جا سکتی ہے۔ اس مجموعے کے کالموں کے نام بھی یہی کہانی سناتے ہیں کہ عورت، اس کا گھر اور اس کے مقدر کے سارے موسم رانی بانو کی کالمی گفتگو کا مرکزی نکتہ بنتے ہیں۔ ''ماں اور بچہ، عورت کی زندگی، عورت کمتر نہیں، عورت اور پانچواں موسم، پتنگ تتلی یا عورت، کیا یہ عورت ہے اور یہ کہانی ہر گھر کی ہے، سمیت کچھ براہ راست عنوات اور کچھ بہت ہی خوبصورت علامتی عنوانات دامن دل کھینچ کر روک لیتے ہیں۔ پشاوری تہذیب کی دلدادہ رانی بانو کے ناسٹلجیا کو بار بار فصیلِ شہر کے اندر کی پرسکون زندگی، شادی بیاہ کی رسومات اور وہ زمانہ یاد آتا ہے جب پشاور شہر میں ''ہمسایہ۔ ماں پیو جایا'' ہوتا تھا۔ رانی بانو کے بارے میں جیون ساتھی پروفیسر صبیح احمد اپنے کالموں میں لکھتے رہتے ہیں کہ وہ میرے بائیک کی مستقل سواری ہے، میں بائیک گردی کو ان دونوں کی سیلانی طبیعت پر محمول کرتا رہا مگر اب ان کے کالم پڑھ کر اندازہ ہوا کہ رانی بانو تو جاب پر تھیں، مشاہدہ کو مہمیز کرتی رہتی ہیں اس لئے وہ اپنے سماج میں جب بھی کوئی بگاڑ کی صورت یا معاشرتی زندگی میں کھنڈت پڑتی دیکھتی ہیں تو اپنے لوگوں کے لئے ان کی دلسوزی کالم کا روپ دھار لیتی ہے۔ پھر ان کے کالم کی

عمومی فضا میں ان کا دوٹوک روّیہ، بے ساختہ اظہار اور شگفتہ اسلوب پڑھنے والوں کو دیکھتے ہی دیکھتے اپنا طرفدار بنالیتا ہے، انہوں نے اس انتخاب میں چند تقریبات کے حوالے سے باندھے ہوئے کالم بھی شامل کئے ہیں مگر ان کی اہمیت بھی وقتی یا عارضی نہیں ان میں بھی اپنی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو مشام جاں معطر کر دیتی ہے میرے لئے ان میں سے ایک کالم تو ایسا بھی ہے جسے پڑھتے ہوئے جذبات سے میری آنکھوں میں دھواں بھرتا رہا کیونکہ اس کالم میں انہوں نے میرے پردیس گئے بیٹے افراز علی سیّد کی پشاور آمد پر ان کے اعزاز میں ہونے والی ایک نشست کا آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے اور یہ محض روداد نہیں ہے، اس کالم میں افراز علی سیّد کی وساطت سے میرے خانوادے کے ساتھ رانی بانو نے اپنی بے پناہ محبت اور بے بدل عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ میں، رانی بانو اور اس کے گھرانے کے لئے کامیابیوں' کامرانیوں اور سکون کے حصول میں سہولت کی دعا کے سوا کیا کر سکتا ہوں۔ سو، رانی بانو جی! سکھ صحت اور فراوانئ رزق کے ساتھ بہت جئیں۔ آمین۔

جولائی 2019 کی پہلی شام

پانچواں موسم

رانی بانو

جو کہوں گا سچ کہوں گا۔۔فلمسٹار امان

میں اپنے دوست معروف فلم اور ٹی وی سٹار امان کی خودنوشت کے ساتھ وقت گزار رہا ہوں اور مجھے ان لمحوں میں ایک طرح سے ایک نئی دنیا کی دریافت کی طرح کا تجربہ ہو رہا ہے خودنوشت لکھنا جان جھوکم کا کام ہے لکھنے والے کو تنے ہوئے رسّے پر چلنا پڑتا ہے ذرا احتیاط کی چھتری پر گرفت کمزور ہوئی تو توازن بگڑ جاتا ہے کیا لکھنا ہے سے زیادہ یہ سوچنا پڑتا ہے کہ کیا نہ لکھا جائے اور اگر لکھنے والا فنکار ہو تو اس کی جان پر دہرا عذاب ہوتا ہے وہ کتنا بھی سچ لکھے کہیں پڑھنے والوں کے ذہن میں یہ شعر بھی گونج رہا ہوتا ہے

کچھ ذہن کے پردے میں چھپا لیتا ہے فنکار
تصویر کا ہر نقش ہویدا نہیں کرتا

دراصل بڑی سکرین کے ذریعے دلوں پر راج کرنے والے فنکاروں کی روزمرہ کی زندگی ان کی اس زندگی سے بہت مختلف ہوتی ہے جس زندگی میں یہ فنکار سکرین پر خود اپنے ہی بنائے ہوئے پاپولر امیجز کے اطراف میں جیتے ہیں، جینا پسند کرتے ہیں، سکرین چھوٹی ہو یا بڑی اس کی اپنی ایک الگ ہی دنیا ہے جو سکرپٹ کی محتاج ہوتی ہے، گویا ایک فنکار کو اپنی نہیں بلکہ رائٹر کی زندگی ڈائریکٹر کی منشا کے مطابق جینا پڑتی

ہے، لیکن دیکھنے والوں کو اس فنکار کے پیچھے اس کی پوری ٹیم کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے کیونکہ شوبز کا یہ شعبہ ''یقین کرنے اور دلانے'' کا شعبہ ہے اور اگر کوئی ایک لمحے کو بھی یہ سوچے کہ سکرین پر نظر آنے والا ایک فنکار ہے اور وہ رائٹر اور ڈائریکٹر کا لکھا اور سوچا ہوا کوئی کردار نبھا رہا ہے تو وہ اس کے ساتھ نہیں چل پائے گا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں نے ''گلزار'' کی اسداللہ خان غالب کی زندگی پر مبنی فلم (ڈکوڈرامہ) ''غالب'' پہلی بار دیکھی تھی (بعد کے زمانوں میں تو بیسوں مرتبہ دیکھ چکا ہوں) تو دوسرے دن کالج میں معروف فنکار پروفیسر ودودؔ منظر اور دوسرے ہم خیال پروفیسر صاحبان کو اس کے بارے میں بتاتے ہوئے میں نے جب اس کی بہت تعریف کی کہ اس میں غالبؔ کے فن و شخصیت کے سارے پہلوؤں کی خوبصورت تصویر پیش کی گئی ہے۔ تو اچانک پروفیسر ودود منظر نے پوچھا کہ غالبؔ کے کردار میں فنکار کون ہے؟؟ آپ یقین جانیں ایک لمحہ کو میں چپ ہو گیا اور ذہن پر زور ڈالنے کے بعد میں نے 'نصیرالدین شاہ' کا نام لیا تھا۔ ان دنوں آرٹ فلموں کا بہت کریز تھا اور پھر نصیرالدین شاہ تو ہمارے سارے گروپ کا فیورٹ فنکار تھا، مگر میں بھول گیا تھا کہ اس فلم میں کوئی فنکار بھی ہے کیونکہ اس فلم پر رائٹر ڈائریکٹر کی مضبوط گرفت اور نصیرالدین شاہ کی بے پناہ پرفارمنس کی وجہ سے میں اسے غالب ہی سمجھ رہا تھا، ویسے بھی اگر اس وقت میں یہ سوچتا کہ یہ کوئی فنکار ہے جو غالب کا کردار نبھا رہا ہے تو میں شاید اس سے وہ لطف نہ لے پاتا جو میں کشید کر رہا تھا، وہ فلم اب بھی میری فیورٹ فلموں میں سرفہرست ہے مگر بعد میں جب جب دیکھی تو جہاں مجھے نصیرالدین شاہ کی عمدہ پرفارمنس نے سرشار کیا وہاں اس کی ''غالب'' کے بیشتر اشعار کی غلط ادائیگی نے بے مزہ بھی کیا۔ اس لئے کہتا

ہوں کہ یہ شعبہ ''میک بلیوو'' کا شعبہ ہے یہ ایک الگ دنیا ہے اور فنکاروں کے پس پردہ زندگی سے بہت مختلف ہے تاہم یہ بھی سچ ہے کہ مقبول فنکاروں کے پرستاران کی اصل زندگی کی سرگرمیاں جاننے کے لئے بھی بہت بے چین رہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ فلم میگزین اور اخبار ہمیشہ بہت پاپولر رہے ہیں جن میں فنکاروں کے پس پردہ زندگی کے حوالے سے ''گاسپ'' شائع ہوتی ہیں، (چھوٹی سکرین کے آنے کے بعد یہی کام اب بہت سے چینلز نے سنبھال لیا ہے)۔ ستر کی دہائی میں انڈیا کے کئی ریڈیو چینلز پر میں نے ''یادِ ایام'' کے نام سے پروگرام سنے تھے جس میں فنکار خود اپنی زندگی کے بارے میں بتاتے تھے، پھر بڑے فنکاروں کی سوانح عمریاں سامنے آئیں جو دوسرے لوگوں نے اپنے طور پر یا اُن فنکاروں کی ہدایات پر لکھیں، کتابی شکل میں شائع ہوئیں اور ان کی بھرپور پزیرائی بھی ہوئی، اس لئے جب ایک دن فون پر مجھے فلمسٹار امان نے بتایا کہ وہ اپنی فلم انڈسٹری میں بتائے ہوئے شب و روز کو فوکس کرتا ہوا اپنی خودنوشت لکھ رہا ہے تو ایک لمحہ کو مجھے خیال آیا کہ تیز روشنیوں میں اپنی زندگی کا ایک بڑا اور قیمتی حصہ گزارنے والا فنکار شاید لکھنے کے عذاب سے بے خبر ہے کہ یہ کام بظاہر جتنا آسان لگتا ہے اتنا ہی ادق اور جان لیوا ہے۔ امیر مینائی نے کہا ہے

خشک سیروں تن شاعر میں لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرعِ تر کی صورت

مگر میں سمجھتا ہوں عمدہ اور تاثیر رکھنے والی نثر لکھنے میں لکھاری کو سیروں نہیں۔ منوں لہو خشک کرنا پڑتا ہے، پھر خیال آیا کہ اچھی اداکاری بھی تو کسی تخلیق سے کم نہیں ہوتی اور ایک اچھے اور بڑے اداکار کو سو سو بار خود کو مارنا پڑتا ہے تب جا کر کوئی کردار سکرین پر

زندہ ہوتا ہے، ورنہ ایسے اداکاروں کی بھی کمی نہیں جو اچھے بھلے زندہ کردار کو بھی اپنی بری اداکاری سے قتل کر دیتے ہیں، اور ایسے لکھاریوں کی بھی کمی نہیں جن کی تحریروں پر نقاد مختصر تبصرہ یوں کرتے ہیں کہ ''اگر اس ناول میں کوئی ویلن ہے تو وہ اس چاہیے کہ وہ پہلی فرصت میں اپنے ناول نگار کو موت کے گھاٹ اتار دے'' لیکن مجھے یہ بھی علم ہے کہ فلمسٹار امان کا شمار چھوٹی بڑی سکرین کے بے بدل تخلیقی فنکاروں میں ہوتا ہے اس کے خال وخد، رکھ رکھاؤ اور کلچرل لیول روزمرہ زندگی میں بھی کسی ہیرو سے کم نہیں، وہ جو ''پیدائشی ہیرو'' کا ایک کلیشے ہے وہ بھی امان پر فٹ بیٹھتا ہے اس لئے اگر آپ کی لک اور ادب آداب ہیرو کے امیج کو ابھار رہے ہوں تو پھر بہترین ایکٹر بننے کا راستہ نسبتاً آسان ہو جاتا ہے، پھر بھی امان کو اپنا آپ منوانے کے لئے شبانہ روز محنت کرنا پڑی کیونکہ اسے پورے کیریئر میں اچھی ٹیم نہیں ملی، ویسے بھی بالی ووڈ کے طالع آزما اور چند فنکاروں سے مرعوب فلم انڈسٹری، ان کی طرح کے ٹیلنٹڈ فنکاروں کی صلاحیتوں سے اجتناب برتتی رہی، جس کا منطقی نتیجہ انڈسٹری کے زوال کی صورت میں بالآخر سامنے آ گیا۔ قابلؔ اجمیری نے کہا ہے کہ

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایکدم نہیں ہوتا

فلمسٹار امان کی اس خودنوشت میں لالی ووڈ فلم انڈسٹری کے زوال کے اسباب کی پوری کہانی کی ایک زیریں لہر مسلسل ساتھ چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، اس خودنوشت میں امان کے انڈسٹری تک پہنچنے سے پہلے کی کہانی بھی بلا کی دلچسپ ہے بچپن اور لڑکپن کے دنوں میں معصوم امان کی بے ضرر شرارتیں اور شوخیوں کے بارے میں

پڑھتے ہوئے بے اختیار ان پر بہت پیار آ تا ہے، ذکر دادا جان کی فرض شناسی اور دیانتداری کا ہو، والدہ کی سادہ لوحی اور ممتا کا یا والد صاحب کے کسی سنگر سے عشق اور پھر اس کی والدہ کو گھر سے نکالنے کے سارے واقعات بلا کم و کاست اس انداز میں یکجا کر دیئے گئے ہیں کہ پڑھتے ہوئے مجھے امان کے ساتھ ساتھ بے اختیار ہنسنا اور رونا پڑ رہا تھا، میں سچ کہتا ہوں بہت دنوں بعد ایک ایسی دل کو کہیں بہت اندر سے چھونے والی خوبصورت، پرتاثیر تحریر پڑھی ہے، واقعات کا ایک نہ ختم ہونے والا بہاؤ ہے جس میں امان کے ساتھ ساتھ بہنا پڑتا ہے، پرائمری سکول کے قصے پڑھتے ہوئے حیرانی ہوتی ہے کہ امان کو کیسے ''یاد سب ہے ذرا ذرا'' خود لکھتے ہیں کہ عمر کے آخری آخری پڑاؤ پر اوائل عمر کے شب و روز یاد آ نا شروع ہو جاتے ہیں، پھر شہر کے سکول کے پہلے دن، ٹسٹ کے ریزلٹ کے نمبروں میں تبدیلی کی کہانی سے لے کر ڈگری کالج تک پہنچنے کے واقعات اور ''لی گروپ'' کی ساری شرارتوں کی تفصیل میں بلا کی روانی اور بے ساختگی ہے، بس پڑھتے جایئے سر دھنتے جایئے اور سرشار ہوتے جایئے کہیں تحریر بوجھل یا ڈریگ نہیں ہوتی۔ ڈگری کالج کی داستان نے اس قصہ گو کے اس راز سے بھی پردہ اٹھایا کہ وہ محض ایکٹر نہیں ہے اس نے تو اوائل عمر ہی سے نہ صرف نسیم حجازی کے ناول اور شعر و ادب پڑھنا شروع کر دیا تھا بلکہ ترجمہ اور شعر و افسانہ کی بانبی میں بھی ہاتھ ڈالا ہوا تھا اور اس کے افسانہ ''جس کی بہار یہ ہو اس کی خزاں نہ پوچھ'' نے اس کے لئے کالج میگزین ''گومل'' کے سٹوڈنٹ ایڈیٹر (اردو سیکشن) کا چناؤ ممکن بنایا، اس خودنوشت میں ٹی وی ڈرامہ کی ''فلیش بیک'' کی تکنیک سے بھی کام لیا ہے۔ جیسے پرائمری سکول کا ذکر کرنے کے بعد امان نے وہ واقعہ بھی لکھا ہے جب

ساٹھ برس بعد وہ اپنے بیٹے کو وہ سکول دکھانے لے گیا، جہاں اس کا خیال تھا کہ ہیڈ ماسٹر اسے کوئی چائے پانی پلائے گا مگر ایسا کچھ نہ ہو سکا (شاید ہیڈ ماسٹر اسے اب بھی ایک سٹوڈنٹ سمجھ رہا تھا اور ایک شاگرد کو چائے پلانا اسے گوارا نہ تھا) امان کی اس خود نوشت کو کہیں سے بھی خصوصاً پہلا حصّہ اگر بار بار بھی پڑھا جائے تو واقعات کا لطف اور تحریر کا ذائقہ پڑھنے والوں کو بے مزہ نہیں ہونے دیتا۔ یہ بلا کا محبتی قصہ گو جب اپنی داستان کے اس موڑ پر پہنچتا ہے جہاں سے اس کا فلم کیریئر شروع ہوتا ہے اس کے قلم میں بھی وہی تیزی اور بے باکی آجاتی ہے جو فلم انڈسٹری کے مزاج میں ہوتی ہے، اب وہ ''لی گروپ'' کا کھلنڈرا نوجوان نہیں رہتا اب اسے لالی وڈ کے باسیوں کے ساتھ رہنے کا ہنر سیکھنا پڑا، اس لئے ان دنوں کی کہانی لکھتے ہوئے اس کی تحریر میں ایک تیکھا پن آجاتا ہے منافقت اور جھوٹ کی دنیا سے بہت فاصلے پر رہنے والا امان سچ کہنے اور لکھتے ہوئے ذرا بھی رورعایت برتنے کو تیار نہیں ہوتا اس لئے ممکن ہے یہ سچ کچھ لوگوں سے ہضم نہ ہو سکے، مگر امان کسی طور اپنی جیون کہانی میں حکمت عملی یا مصلحت کا پیوند لگانے کو تیار نہیں، وہ ایک سچا داستان گو ہے جس نے نہ تو اپنے والد کے کسی سنگر سے عشق پر پردہ ڈالا، نہ بیٹے کی نوکری کے لئے اپنے بے تکلف دوست کے پاس سفارش کے لئے جانے اور وہاں سے مایوس لوٹنے کا دکھ چھپایا، نہ ہی صدارتی ایوارڈ کے حصول کے لئے اپنی تگ ودو کو صیغہ راز میں رکھا اور تو اور اس نے تو انگلینڈ میں گزارے ہوئے اپنے شب وروز کی سرگرمیوں تک کو اپنی کہانی سے سنسر نہیں کیا اور نہ اس خودنوشت کی اشاعت کے لئے مستنصر حسین تارڑ کی سردمہری اور کٹھور پن کو حذف کیا، اسے علم تھا کہ لوگوں کے روّیے وقت کے ساتھ بدل جاتے ہیں جب وہ سٹار تھا تو

احباب کی ملاقاتوں میں بلا کی گرمجوشی تھی، اور ذرا ہوا بدلی اور انڈسٹری زوال پزیر ہوئی تو پھر ''کس نہ می پرسد کہ بھیا کیستی'' آخر پرنس آف منروا صادق علی بھی تو کراچی کی سڑکوں پر پان سگریٹ کے لئے پچاس پیسے مانگتا مانگتا بھولی بسری کہانی بن گیا تھا اور'' میرا نشانہ دیکھے زمانہ، تیر پہ تیر چلاؤں بچ کے نہ کوئی جائے'' اور '' تیری الفت میں صنم، دل نے بہت درد سہے اور ہم چپ ہی رہے' جیسے گیتوں کی ابھی نیتری ''لارالپا گرل' مینا شوری بھی تو ایک سرکاری ہسپتال کے جنزل وارڈ میں جوس کے ایک پیکٹ کی التجا کرتی ہوئی دنیا چھوڑ گئی، اس معاشرے سے کوئی بھی کسی سے کیا توقع رکھے، اچھے دنوں کے دوستوں میں سے کم بہت ہی کم بعد کے دنوں میں خبر گیری کرتے ہیں، ہنسنے کے موسم کے ساتھ سب ساتھ دیتے ہیں لیکن رونے کی رت اکیلے ہی گزارنی پڑتی ہے جب سر رکھنے کے لئے ایک کاندھا بھی میسر نہیں ہوتا، لیکن امان کی وفا داری بشرط استواری ہی رہی اور اس خود نوشت کے آخری حصے میں اس نے دوستوں کا ذکر بہت محبت سے کیا ہے اس نے بعض دوستوں کی تھڑ دلی کی نشان دہی بھی کی ہے مگر ان سے اپنی محبت اور احترام کا بھی کھل کر اعتراف کیا ہے، اور اُن بچھڑنے والے احباب کو بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھنے کا ذکر کیا ہے جنھوں نے اسے دکھ دیئے۔ امان کی اس خودنوشت میں جہاں جہاں انہیں موقع ملتا رہا وہ ملکی سیاست پر بھی بات کرتے ہیں جن سے ان کے سیاسی شعور کا بھی اندازہ ہوتا ہے اسی طرح سماج سدھار کے لئے بھی ان کا قلم اپنا فرض اور قرض ادا کرتا ہے، فلم انڈسٹری تو خیر ان کا اوڑھنا بچھونا رہی ہے مگر پی ٹی وی پر کام کرنے کے دوران وہاں کے مسائل پر بھی ان کی توجہ رہی چنانچہ ان کی تنقید میں بلا کا وزن ہے، پشاور مرکز میں جس طرح انتظامیہ

کے ریلیکس ہونے کی وجہ سے حالات میں بگاڑ پیدا ہوا ہے امان نے اس کا کھرا تجزیہ کیا ہے کہ 'اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے'۔ اس طرح خودنوشت کے جس حصہ میں دلیپ کمار کی پشاور آمد کا ذکر ہے امان کی تحریر میں دلیپ کمار سے ان کی محبت عقیدت دلی لگاؤ اوران کے فن سے جذباتی وابستگی پڑھنے والے کو بھی سرشار کر دیتی ہے، پشاور میں دلیپ کمار کی ساری سرگرمیوں کا بہت ہی مفصل، دلکش اور دلنشین انداز سے ذکر کیا ہے۔ البتہ جس مرکزی تقریب کے لئے انہیں ناظم جیوانے پاکستان (پشاور) بلایا تھا اس کا ذکر ممکن ہے اس لئے نہیں کیا گیا کہ شاید امان اس میں شریک نہیں ہوں گے، دراصل دلیپ کمار کے پشاور آنے کا مقصد فاطمید بلڈ فاؤنڈیشن کے پشاور سنٹر کا افتتاح کرنا تھا اور یہ تقریب نشتر ہال میں اس وقت کے وزیر اعلیٰ ارباب محمد جہانگیر خان کی صدارت میں ہوئی تھی، مجھے اس لئے بھی اس کی تلاش تھی کیونکہ اس بڑی تقریب کی کمپیئرنگ کا اعزاز مجھے حاصل ہوا تھا۔ امان کی اس تحریر میں کچھ جگہوں پر انگریزی کا غلبہ زیادہ ہے جو برا تو نہیں لگتا لیکن اگر یہ کم ہوتا تو شاید بہتر ہوتا۔ امان کی تحریر میں ادبی چاشنی، بھید بھاؤ اور رکھ رکھاؤ دل موہ لیتا ہے پھر اسے منظر کشی پر مکمل عبور حاصل ہے وہ جب شفق سے آسمان کے کناروں کو نارنجی بنانے والی شام کی لفظی تصویر بناتا ہے تو غزل کے شعر کی طرح بے ساختہ منہ سے ''مکرر ارشاد'' کا نعرہ بلند ہوتا ہے اوراس کے جواب میں ان سطور کو خود ہی بار بار پڑھنا پڑتا ہے، تاہم جس باب نے مجھے چپ کرا دیا، میری آنکھوں میں دھواں بھر دیا اور کتاب سینہ پر رکھ کر مجھے اپنے اعصاب سہلانے پر مجبور کیا وہ امان کے جیون ساتھی کے بچھڑنے کا منظر تھا۔

میرا ہیرو اپنی زندگی کی ڈائمنڈ جوبلی مناتے ہوئے آج بھی وکٹری سٹینڈ پر کھڑا ہے اور

اس خودنوشت کے شائع ہونے کے بعد آنے والے وقتوں میں بھی تاریخ کے پنوں میں تابندہ رہے گا کہ اس کے قلم نے زندگی کے کسی بھی موڑ پر کسی قسم کی مصلحت کا شکار ہوئے بغیر ڈنکے کی چوٹ پر جو کہا ہے سچ کہا ہے سچ کے سوا کچھ نہیں کہا۔ براوو برادر۔

2021 کے پہلے مہینے کی 18 ویں صبح

میں ایک فلاپ ہیرو ہوں

مصنف: فلمسٹار امان

اداسی کا نیلا رنگ

بات بہت سیدھی سادی ہے کہ مرے ماحول میں جہاں صورت حال غیر یقینی ہے وہاں بے ترتیب بھی ہے چیزوں کو دیکھنے کے لئے، سمجھنے کے لئے یا تو کوئی ایسا پیڈسٹل چاہیے جہاں سے ماحول کے نقش ونگار واضح نظر آئیں یا پھر کسی صوفی کی طرح اشیا کو اپنے اندر اکٹھا کر کے انہیں سجا سنوار کر ایک ایسی ترتیب اور شکل دے دی جائے جس سے کائنات کی خوبصورتی اپنی معنویت کو منکشف کرنا شروع کر دے صوفی اس میں اپنی ریاضت کے زور سے کامیاب بھی ہو جاتا ہے، مگر المیہ یہ ہے کہ صوفی کی یہ دنیا صرف اسی کو سرشار کر سکتی ہے، اسی کے لئے سلوک کے مراحل کو آسان بھی بنا سکتی ہے مگر صوفی اس دنیا کو نہ تو ''عام'' کرتا ہے اور نہ ہی عام کرنے کا پابند ہے، اس لئے ایک بے ترتیب، بے یقین اور بے لگام معاشرے میں اشیا کی بے ترتیبی کو ایک نظم وضبط میں لانے، دیکھنے اور اس سے آگے بڑھ کر دکھانے کی تمام تر ذمہ داری ایک شاعر کی ہی ہو تی ہے، شاعر جو اپنے سماج کی آنکھیں بھی ہے چہرہ بھی اور ایک ایسا معالج بھی جسے تشخیص اور علاج دونوں کی آگہی ہے، شاعر بے ترتیب چیزوں کو جب اپنے تصور میں اپنے محبوب کے لئے سجاتا سنوارتا ہے تو غزل کا روپ دیتا ہے اور جب ان اشیا کو ایک قاعدہ اور ڈسپلن کا پابند بنانے کی سعی کرتا ہے تو ایک نظم جنم لیتی ہے جس میں

دراصل یہی خواہش پوشیدہ ہوتی ہے کہ ہر چیز اپنے اپنے مقام پر رکھ دی جائے تو یہ دنیا یہ ماحول، جو کسی طور رہنے کے قابل نہیں، اسے رہنے کے قابل بنایا جاسکتا ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ گزرے ہوئے تکلیف دہ شب وروز میں میرے شاعر غزل سے زیادہ نظم کی طرف متوجہ ہوئے، اور نہ صرف اردو میں بلکہ تمام تر پاکستانی زبانوں کے شاعری پر نظم ہی کا راج رہا اور نظموں کے جتنے اچھے شعری مجموعے گزشتہ ایک دہائی میں آئے اس سے قبل غالباً نہیں آئے پھر یہ بھی ہوا کہ اگر نئے شعری مجموعے دیکھے جائیں تو ان میں بھی غزلوں کے ساتھ ساتھ ایک بڑی تعداد نظموں کی بھی نظر آتی ہے، مجھے جب سید شکیل نایاب کے مجموعے کا مسودہ ملا تو گماں یہی تھا کہ یہ نظموں کا مجموعہ ہوگا کہ وہ ایک عمدہ نظم گو کی حیثیت سے اپنی ایک بھرپور پہچان بنا چکا ہے، مگر اس میں آغاز ہی میں کچھ غزلیں شامل کی گئی ہیں لیکن جب پوری کتاب دیکھی تو معلوم ہوا کہ یقیناً اس میں غزلیں تو ہیں مگر لگتا ہے کہ محض منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے ہی یا نظموں کی یکسانیت سے بچنے کے لئے ہی غزلوں کو شامل کیا گیا ہے، کیونکہ غزلوں کی تعداد بہت کم ہے، اس لئے میں نظموں ہی کے آس پاس رہا، اور جتنا وقت میں نے شکیل نایاب کے ''اب ستارے میری تلاش میں ہیں'' کے ساتھ گزارا ہے، میں مسلسل ایک دکھ اور درد کے نیلے سمندر کے ساحل پر موجوں سے شرابور ہوتا رہا، مجھے ان نظموں کی فضا میں آس اور یاس کے پنچھی اپنے ہونے کے یقین کے ساتھ اڑتے نظر آئے، دکھ درد اور اداسی کے جس نیلے سمندر کی موجوں سے وہ خود بھی کھیلتا ہے۔اور اپنے لوگوں کو بھگوتا رہتا ہے، یہ الگ سے ہنر ہے جو ہر تخلیق کار کو ودیعت نہیں ہوتا کہ جب وہ ذاتی حوالے سے بُنی ہوئی نظموں کو بھی پڑھنے والوں کے تجربات میں ضم کر دیتا ہے، مجھے ان نظموں میں کوئی

پیچیدہ، نامانوس، غیر متوقع یا ماورائے حقیقت مناظر نظر نہیں آئے یا پھر اس نے اتنی مہارت سے ان کی بنت کاری کی ہے کہ کہیں بھی پر اسراریت یا سرریلزم کی بھول بھلیوں کا شائبہ تک نہیں گزرتا، جب میں اداسی کے نیلے رنگ کی بات کرتا ہوں تو میرے پیش نظر میرؔ کی شعری فضا ہوتی ہے جس کا ادراک یقیناً سید شکیل نایاب کو بھی ہے اس کا احساس مجھے یوں ہوا کہ جب وہ صوفی کی طرح اشیا کو اپنے اندر اکٹھا کر کے انہیں نئے سرے سے ترتیب دینے کی سعی کرتا ہے تو شاعرانہ ہنر کو بروئے کار لاتے ہوئے ان کا مزاج بدل دیتا ہے اور اس کا اعتراف کرتے ہوئے کہہ اٹھتا ہے کہ

کہیں خورشید کے شفاف عارض پر
زہر آلودہ آنکھوں کی کوئی تحریر لکھتے ہیں
غزل غالبؔ کی لکھ کر داستانِ میرؔ لکھتے ہیں

یہ جو غالب کی کہانی پر میر کا رنگ چڑھانے کی مشق ہے یہ بجائے خود ایک کرب اور اذیت کے سمندر کو ڈوب کر پار کرنے کے مترادف ہے تو اس کے معانی کیا یہ نہ ہوئے کہ اپنے لوگوں تک اشیا کو دلکش اور قابل قبول بنا کر پیش کرنے کے لئے شاعر اپنے تخلیقی عمل کے دوران دہرے عذاب سے گزر رہا ہوتا ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ شکیل نایاب کا شعری منظرنامہ خودفراموشی کی اذیت سے ترتیب پاتا ہے جس میں یادوں کی ''تتلیاں دائرے بناتی ہیں، اور یہ دائرے درد کی ٹھہری جھیل میں اداس کنکر بناتے ہیں،

اور میں راہ میں کھڑا یوں ہی
گزرے لمحوں کو جذب کرتا ہوں

درد کو دائرے کا غم دے کر
بھول جاتا ہوں میں ہنسی اپنی
خود فراموشیوں کی یہ منزل
کم نصیبوں کو مل نہیں سکتی

سو اسی خود فراموشی کے نشیب و فراز میں ہی وہ اپنا شعری سفر طے کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے جو بیک وقت اس کی نظموں کو ایک بھرپور نقطہ آغاز بھی مہیا کرتا ہے اور اس کے اس شعری سفر کو اعتبار بھی بخشتا ہے۔ ان نظموں میں یادوں کی جو خوشبو بسی ہوئی ہے وہی ان کے عمومی رچاؤ کو رمزیت کی ایک جاذبیت اور گداز بھی دیتی ہے جسے وہ خود بار بار مہکتی داستاں اور یادوں کی خوشبو کے احساس سے سجاتا سنوارتا ہے، اسی وجہ سے جب وہ اپنی گڑیا رانی کے لئے نظم کے پیرائے میں بات کرتا ہے تو وہ ذاتی نظم (ترے موسم سلامت ہوں) اپنی سطح سے اٹھ کر ایک ایسی تصویر بن جاتی ہے جس کا سپیکٹرم ہی جدا کیف رکھتا ہے گویا یہاں آ کر وہ عمومی نیلا رنگ نارنجی رنگ میں بدل جاتا ہے۔ مجھے اس مجموعے کی نظمیں ایک ہموار اور پُرسکون منطقہ میں سانس لیتی نظر آتی ہیں ان میں جہاں تخلیقی وفورِ شدتِ احساس اور مختلف رویوں کو ایک اکائی کی صورت دینے کی سعی نظر آتی ہے وہاں ان نظموں کا لفظیاتی اور استعاراتی نظام بھی ان نظموں کو برتنے اور بسر کرنے کو ایک کیف آفرین تجربہ میں ڈھال دیتا ہے۔ اس نظم کو پڑھتے ہوئے اس مجموعے کی نظموں کی بارہ دری میں داخل ہو جایئے ہر دروازہ ایک نئی کہانی سنانے کو آپ کا منتظر ہے

ادھورے خواب

وہی برسات کا موسم
وہی یخ بستہ شامیں ہیں
وہی لمحے وہی دھڑکن
وہی یادوں کی رعنائی
وہی بھیگی ہوئی پلکیں
دلوں کو درد بن کر اک
ادھورے خواب کی خوشبو
مرے من میں مہکتی ہے

2018ء کے مارچ کی آخری شام

اب ستارے میری تلاش میں ہیں
شکیل نایاب

مرگ حال افسانے سے بھرپور زندگی تک

وہ بچپن ہی سے چیزوں کو ترتیب سے دیکھنے کا متمنی تھا۔اسی میں اسے حسن نظر آتا تھا اور خوبصورتی اس کی کمزوری تھی۔سول انجینئر بنا اسی خواہش کا نتیجہ اور اسی خواب کی تعبیر تھی۔جب وہ اسی کے ساتھ شعور کی عمر میں پہنچا تو اسے اپنی تحریر کو سنوارنے کا خیال آتا اور سائنس کا طالب علم ہونے کے باوجود وہ ممتاز صحافی،افسانہ و ڈرامہ نگار احسان طالب کے پاس خطاطی سیکھنے جا پہنچا۔پھر زندگی کو خوبصورت دیکھنے اور دکھانے کے لیے اسے افسانہ کی طرف جانا پڑا۔جب وہ اپنا پہلا افسانہ ''نساء'' لے کر اپنے استاد احسان طالب کے پاس پہنچا اور ان کو افسانہ دکھایا تو انہوں نے رکھ لیا اور دوسرے دن جب وہ افسانہ لینے گیے تو لال روشنائی سے استاد نے اتنی غلطیوں کی نشاندہی کی کہ شاگرد کو کہنا ہی پڑا ''سر جی آپ نے تو میرے افسانے کو لہولہان کر دیا ہے۔'' وہ بھی استاد تھے جواب دیا ''نہیں برخوردار آپ کا افسانہ مرگ حال تھا میں نے اسے خون چڑھایا ہے۔'' اور پھر ایک سنہری بات کی،''کہ تھوڑا لکھو اور بہت پڑھو،مطالعہ کرنا، لکھنے کے لئے بہت ضروری ہے'' سو پشاور کی یادوں کو دل میں بسائے ہوئے کل کے طالب علم اور آج کے افسانہ نگار اور مترجم کا نام مشتاق احمد مشتاق ہے۔جب میں نے اسے اپنی کتاب ''زندگی'' دی جو کہ ہندکو زبان میں ہے تو انہیں بہت پسند آئی اور بقول

ان کے کئی بار پڑھی۔ پھر اپنی مسز کو پڑھنے کے لئے دی تو اصل کہانی یہاں سے شروع ہوئی کہ ان کی مسز نے یہ کہہ کر واپس کر دی کہ میں تو ہندکو نہیں پڑھ سکتی۔ اس بات نے مشتاق احمد مشتاق کے ذہن میں اس سوچ کا پھول کھلایا کہ ان کی بیگم کی طرح کتنے ہی لوگ پاکستانی زبان ''ہندکو'' میں لکھے ہوئے اس ڈرامہ اور اس کی وزڈم سے محروم رہ جائیں گے۔ مجھ سے رابطہ کیا اور اجازت مانگی۔ میرے لئے یہ بات خوشی اور طمانیت کا باعث بنی مگر انہوں نے اسی رات اردو دنیا کے لئے پشاور کی طرف سے ایک تحفہ پیش کرنے کا ارادہ کیا اور اپنی تمام تر مصروفیات کی باوجود ہندکو ڈرامہ ''زندگی'' کو اردو میں منتقل کرنے کا آغاز کر دیا۔ چند اوراق میں نے دیکھے اور حیران رہ گیا، ایسا رواں دوان، تخلیقی اور عمدہ ترجمہ کے ان سے زیادہ میری خواہش ہوئی کہ یہ جلدی مکمل ہو اور اسے کتابی شکل دی جائے۔

اپنی بات۔ ترجمہ ڈرامہ زندگی

زندگی

مترجم: مشتاق احمد

رحمان بابا۔ایک تعارف

اردو زبان کے ایک ممتاز شاعر اصغر گونڈوی نے کہا تھا۔

اصغر سے ملے لیکن اصغؔر کو نہیں دیکھا
اشعار میں، سنتے ہیں کچھ کچھ وہ نمایاں ہیں

اصغر گونڈوی یقیناً اشعار میں بھی نمایاں ہیں اور ویسے بھی جانے پہچانے شخص اور شاعر تھے لیکن رحمان بابا اپنے اشعار میں کچھ کچھ نہیں مکمل طور پر اپنی شخصیت کے تمام تر جلال و جمال اور خوبی و کمال کے ساتھ نمایاں بھی ہیں اور اپنے ارادت مندوں، عقیدت مندوں اور چاہنے والوں کے دلوں میں اپنے لئے بے حد احترام، محبت اور عزت بھی رکھتے ہیں۔اپنے شعر کے ناتے تو وہ سارے پختونوں کے دلوں کی دھڑکنوں میں بستے ہیں۔مگر رحمان بابا کے حالاتِ زندگی کے بارے میں، خصوصاً پیدائش اور اوائل عمر کے حوالے سے بات کی جائے تو کوئی صحیح اور حتمی رائے سامنے نہیں آتی۔شاید بابا نے بہت گمنامی میں وقت گذارا ہے۔البتہ جس زمانے میں انہوں نے آنکھ کھولی اور پروان چڑھے اس زمانے کی روشنی میں انہیں تلاش کیا جاسکتا ہے کہ ان کے شعر پر اس کے عہد کا پرتو نظر آتا ہے لیکن وہ کون تھے ان کے والد کون تھے، بہن بھائی تھے تو ان کا طرز زندگی اور ذریعۂ معاش کیا تھا۔اور کیا اس کے قبیلے میں کوئی اور شاعر بھی ہو گذرا

ہے بابا ایک شعر میں یہ تو فرماتے ہیں کہ میرے سارے قبیلے میں، میرے سوا کوئی اور ایسا نہیں جس کی شاعری کی کتاب مرتب ہوئی ہو،اس حوالے سے میں پہلا شخص ہوں، گویا شاعر تو اور بھی رہے ہوں گے مگر کتاب جتنی شاعری کسی نے نہیں کی یا پھر کوئی سرے سے شاعر ہی نہیں تھا۔ پھر یہ بھی علم نہیں کہ اگر ان کی کوئی اولاد تھی تو کیا ان میں بھی شاعری کا جوہر تھا جیسا کہ خوشحال خان خٹک کا گھرانہ تھا۔اور یہ بھی معلوم نہیں کہ انہوں نے کن اساتذہ سے دینی، دنیاوی تعلیم یا شعر کی تربیت حاصل کی تھی۔اور پھر ان کی شاعری کی ہمہ گیری کے پیچھے ان کی سیر وسیاحت کا کوئی عمل دخل بھی تھا یا اپنے علاقہ سے باہر جانے کا انہیں موقع ہی نہیں ملا۔ یہ سب سوال بہر حال تحقیق طلب ہیں۔ یوں تو اس ضمن میں کچھ محققین نے اپنی سی سعی ضرور کی لیکن ان کو بھی سو فی صد مستند نہیں تسلیم کیا جاتا، ویسے بھی ان سب کی تحقیق کا ماخذ اور منبع ممتاز ومشہور مستشرق میجر راورٹی کی تحقیقات ہیں جس نے ''افغانوں کی شاعری کا انتخاب'' نامی کتاب شائع کی۔جس میں 16 ویں صدی سے لے کر 19 ویں صدی تک کے معتبر اور قد آور پشتون شعراء کے کلام کا انگریزی ترجمہ کیا گیا ہےاوراس کتاب کے شروع میں صوفی مسلک اور صوفی شاعری کے اسرار ورموز پر ایک مربوط اور مبسوط مقدمہ لکھا ہے۔ان بڑے شعرا میں عبدالرحمٰن بابا بھی شامل ہیں۔راورٹی کی یہ کتاب تذکرہ کے ذیل میں آتی ہے اس میں ان شعرا کے پابند انگریزی ترجمہ کے ساتھ ساتھ مختصر حالات زندگی اور دیگر کوائف بھی شامل ہیں۔اس میں رحمان بابا کے بارے میں جو معلومات فراہم کی گئی ہیں وہ اگر چہ مکمل طور پر مستند نہیں گردانی جاسکتیں۔مگر کلی طور پر ان کے حالات پر جو پردۂ اخفا پڑا ہوا تھا اس کے تناظر میں راورٹی کی یہ معلومات بھی

غنیمت ہیں۔انہوں نے لکھا ہے

''افغان شعراء میں سب شعراء سے زیادہ مقبول اور ہر دلعزیز اور بڑا شاعر عبدالرحمان بابا ہے۔جس کی شاعری کو مذہبی اور اخلاقی کہا جا سکتا ہے۔اور اس کا بنیادی حوالہ ''عشقِ الٰہی'' ہے۔اور دیگر مسلم شعراء کی طرح رحمان بابا کی شاعری بھی تصوف کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے میں نے اس کتاب کے پیش لفظ میں تصوف کے مضمون پر بحث کی ہے لیکن اس سے ہٹ کر رحمان بابا کے اسلوب میں تو جیسے آگ بھری ہوئی ہے اور پھر کمال سادگی بھی ہے جو اسے ودیعت کی گئی ہے۔اور ایسی سادگی و پرکاری اور خوبصورتی میں نے فارسی زبان کی لفاظی اور صنائع بدائع سے بھری ہوئی شاعری میں دیکھی''۔

مزید انہوں نے اس نابغہ روزگار کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات بھی دی ہیں۔ان کے مطابق رحمان غوریا خیل تھا اور یہ افغانوں کے مومند قبیلے کی ایک شاخ ہے(یہ اور بات کہ دراصل مومند قبیلہ غوریا خیل کی تین بڑی شاخوں یعنی خلیل، داؤد زئی اور مومند میں سے ایک شاخ ہے)اور وہ ایک درویش شاعر تھا جو ہمہ وقت یادِالٰہی میں مصروف رہتا۔اور ایک زمانے میں تو بالکل گوشہ نشینی کی زندگی گذارنے لگا۔جہاں رات دن اسے بس رونے ہی سے کام رہتا اور کبھی کبھار کوئی دوست اس کی طرف جا نکلتا تو اسے رونے میں ہی غرقاب پاتا اور کہتے ہیں کہ اس کے چہرے پر مسلسل اشک بہانے سے لکیریں پڑ گئی تھیں۔بقول شکیب جلالی

کیا کہوں دیدہ تر یہ تو مرا چہرہ ہے
سنگ کٹ جاتے ہیں بارش کی جہاں دھار گرے

لیکن بابا کی گوشہ نشینی بھی سماج سے برداشت نہ ہوئی اوران پرتارک الدنیا ہونے کے الزام لگانا شروع کردیئے مجبوراً قریبی دوستوں کے اصرار پرانہیں باہر نکلنا پڑا یہ سب واقعات ان کی غزل کے موضوعات بھی بنے۔ بہرحال انہی دوستوں نے پھران کے اشعار کو جوزباں زدِ خاص وعام تھے اکٹھا کیا اور دیوان کی صورت دی۔ ہر چند بعض دوستوں نے اپنے کہے ہوئے شعر بھی اس میں شامل کردیئے مگر خوش قسمتی سے رحمان بابا کے اپنے کہے ہوئے شعر اتنے مشہور اور مقبول تھے اور پھران کا طرز بیان اور طرز احساس اتنا منفرد تھا کہ کوئی دوسرا شاعر اس میں بار ہی نہیں پا سکتا تھا۔ پھران کے قریبی دوستوں کوان کے شعر حرف بہ حرف یاد تھے اس لئے بابا کی وفات کے بعد ایک مستند اور صحیح دیوان سامنے آیا جو آج بھی اتنا ہی مقبول ہے میجر راورٹی کے مطابق انہوں نے مختلف برسوں کے ساٹھ کے قریب مرتب شدہ نسخے دیوان کے دیکھے جن کی بعض غزلوں میں ایک آدھ شعر کم یا زیادہ تھا۔ بہرحال شاعر رحمان کے یہ سارے حوالے سامنے ہیں۔مگر شخص رحمان کے بارے میں محقق ابھی تک معتبر حقائق سامنے نہیں لا سکے ہر چند کہ محمد ہوتک مئولف ''مخزنِ مخفی''(پٹہ خزانہ) نے بھی اپنے طور پر بابا کے بارے میں لکھا ہے کہ مومند قبیلے سے تعلق رکھنے والے عبدالرحمان کے والد کا نام عبدالستار تھا، ملا محمد یوسف کے شاگرد تھے اور **1042** ھ میں پیدا ہوئے اور **1118** میں رحلت کر گئے۔لیکن یہ بھی مستند نہیں مانا جاتا اور نہ ہی پادری ہیوز، عجب خان، پروفیسر عبدالمجید افغانی اور حبیبی کی معلومات حتمی مانی جاتی ہیں جبکہ دوست محمد کامل اور میر عبدالصمد کے بیان کردہ حالات بھی میاں سید رسول رسا اور دوسرے رحمان شناسوں کو سابقہ تحقیق کی محض تکرار لگتے ہیں۔ پشاور کے رہنے والے ایک ممتاز شاعر

جلیل حشمی نے کیا خوب کہا ہے

شرم سے شہر کا سر نیچا تھا
میں نے جب اپنا پتہ پوچھا تھا

تاہم اس بات پر سارے محققین متفق ہیں کہ رحمان بابا غوریا خیل مومند تھا اور ایک صوفی شاعر تھا جس نے اپنی ساری زندگی عشقِ الٰہی میں گذار دی۔ اور اپنے عشق و جذب کی قوت اور شعر کی تاثیر سے چار دانگ عالم میں شہرتِ دوام کا حامل بنا۔

انتخاب رحمان بابا

مصنف: طٰہٰ خان

ایک روحانی تجربہ

میں سمجھتا ہوں کہ نعت کہنا کسی بھی شاعر کے لئے کئی حوالوں سے ایک بہت مشکل کام ہے کیونکہ اس میں جہاں باقی اصاف شاعری کی طرح زبان و بیان پر عبور ودیعت شدہ شاعرانہ صلاحیت اور فنی محاسن کی ضرورت تو لامحالہ ہوتی ہے مگر نعت کہنے کے لئے اس کے ساتھ ساتھ آقائے نامدارﷺ سے والہانہ محبت، عشق رسول میں شرابور ہونا دل اور دماغ کا اجلا اور شفاف ہونا، احساسات میں ایک وارفتگی، محسوسات میں خلوص اور تطہیر اور سب سے بڑھ کر اللہ کا کرم اور حضور پرنور کی نظر کرم کا اشارا بھی ضروری ہے کیونکہ نعت گوئی کی توفیق کسی کسی کو عطا ہوتی ہے اس لئے لاکھ خواہش اور کوشش کے معتبر اور قدآور شاعر بھی ایک دو نعتیں کہنے سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ مان لینا چاہئے کہ نعت بغیر اذن کے لکھی یا کہی ہی نہیں جا سکتی، اس لئے جب میں ان شعرا کی طرف دیکھتا ہوں جن کے نعتیہ شعری مجموعے ترتیب پاتے ہیں تو اپنی بے بضاعتی اور محرومی کا احساس سانس چھوٹے کر دیتا ہے۔ 'حسرت آتی ہے یہ پہنچا میں رَہا جاتا ہوں' لیکن میں جانتا ہوں کہ ''ایں سعادت بزور بازو نیست'' دوستِ عزیز شعیب نوید خان کا نعتیہ شعری مجموعہ ''نعت خزینہ'' پڑھتے ہوئے بھی میں یہی سوچتا رہا کہ ان پر اللہ تعالیٰ کا کرم اور فخر موجوداتﷺ کی خاص نظر ہے جو مسلسل ان سے دربارِ رسالت مآبﷺ میں

حاضری لگوا رہی ہے، وہ ایک کے بعد ایک نعت کی مالا پرو رہے ہیں اور بلا تکان عشق رسول ﷺ میں سرشار ہو کر عاشقی کے سارے مدارج طے کرتے ہوئے آگے بڑھتے جا رہے ہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں اور برملا اس کا فخر یہ اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں

یہ جو میری عاشقی ہے یہی ایک ہے حقیقت
میں تو عاشق نبی ہوں مجھے کام کیا گماں سے

شعیب نوید خان کے شعر دامن دل اس لئے کھینچتے ہیں کہ وہ جب حمد ربِّ ذوالجلال کرتے ہیں تو محبوب سلطانی کی حبُ سے الگ نہیں ہوتے اور جب نعت کی اور جاتے ہیں تو ربِّ جلیل کی ثنا سے غافل نہیں ہوتے یہ مجموعہ حمد و نعت و منقبت پڑھنے والے کو مسلسل جلال و جمال اور جذب و مستی کی ایک بہت ہی پاکیزہ اور معطر کیفیت سے مسحور رکھتا ہے اور جس طرح شعیب نوید کے لئے نعت گوئی ایک روحانی تجربہ کا حاصل بنتی ہے اسی طرح پڑھنے والے کو بھی نعت خزینہ رعنائی اور زیبائی کی ایک بے بدل دنیا کا راہی بنا دیتا ہے، جہاں وہ شعیب نوید کے دلی جذبات اور وارداتِ قلبی میں خود کو شریک پاتا ہے اور یہ کمال کم کم سخنوروں کو ودیعت ہوتا ہے، نعت خزینہ کی ایک اضافی خوبی یہ بھی ہے کہ کہیں بھی کسی بھی حمد میں ،نعت یا منقبت میں سادگی، بے ساختگی اور عشق و عقیدت کے پرخلوص اظہار کو پر پیچ تشبیہات اور مشکل تراکیب، عروضی بھول بھلیوں اور دور از کار استعارات سے مملو نہیں کرتا، تا کہ نعت کے اشعار میں 'از دل خیزد بر دل ریزد' والی کیفیات رچ بس جائیں اس لئے کہیں بھی ان کا شعر بوجھل نہیں ہونے پاتا۔

حسنِ کامل ملا مدینے میں
عشق بین السطور دیکھا ہے
رابطے آپ کی عنایت ہیں
ورنہ ملتا کہاں خدا سے میں
نکلے سزا کے واسطے تیری بہشت سے
تیری زمیں پہ تیرے ہی مہمان بن گئے

نعت خزینہ پڑھتے ہوئے میں شعیب نوید کی قلبی واردات میں بھی شریک ہوا اور ان کے کرافٹ کا بھی قائل ہوا کیونکہ حمد و نعت کا سارا سفر انہوں غزل کی چھاؤں میں بیٹھ کر طے کیا ہے اور ایسے ایسے کمال شعر روک روک لیتے ہیں کہ دل و دماغ سرشار ہو جاتا ہے۔

روح خوش ہو گئی ، دل دھڑکنے لگا
سانس آنے لگی ، ذہن کھلنے لگا
ڈھونڈنے سے کہیں نہیں ملتا
کون جانے کہا ں کہاں ہے تو
اشک آنکھوں سے جاری ہوئے اس طرح
ہچکیاں بندھ گئیں ۔ الاماں الاماں
زندگی کی کہانی بیاں ہو گئی
مجھ پہ میری حقیقت عیاں ہو گئی

اور جب شعیب نوید یہ کہتا ہے کہ 'مجھ پہ میری حقیقت عیاں ہو گئی' تو یہی دراصل زندگی

کی الجھی ہوئی ڈوری کا وہ سرا ہے جس کی تلاش میں انسان عمر بھر در بدر مارا مارا پھرتا ہے جب کہ اس کا سہل راستہ عشق خدا اور حب رسول ﷺ ہے اور اسی پاکیزہ روشنی سے خود کو بھگو کر ہی اپنے ہونے کا اعتبار پایا جا سکتا ہے اور یہی اعتبار اور خود شناسی پھر ساری گنجل گرہیں کھول دیتی ہے، کیونکہ۔۔۔۔۔۔۔

جو تری راہ سے گریزاں تھے

ان کو راہوں میں در بدر دیکھا

۱۴۴۳ کے ذی الحجہ کی ۱۶ ویں صبح

نور خزینہ،

شاعر: شعیب نوید خان

جنھیں نعت چُنتی ہے

شعر گوئی تو عطیۂ خداوندی ہے جسے مشق اور ریاضت سے سجایا اور سنوارا تو جا سکتا ہے مگر بغیر توفیق کے ایک مصرع بھی موزوں کرنا ممکن نہیں ہوتا، لیکن جب یہ ہنر عطا ہو جائے اور شعر اترنے لگیں تب بھی مدح رسول ﷺ میں کچھ کہنے کی ہمت اور حوصلہ نہیں پڑتا۔ اساتذہ فارسی کے ہوں یا اردو کے نعت نبی ﷺ کی روایت عجم میں ان سے چلی، مگر کم کم اساتذہ نے مسلسل نعت گوئی کی ہے۔ البتہ اپنے دواوین ترتیب دیتے ہوئے آغاز میں حمد و نعت کا التزام ضرور کیا جاتا۔ اساتذہ سے بہتر کون جانتا تھا کہ دنیائے عشق کی بنیاد حُب پر استوار ہے۔ اور حُب کی معراج عشق نبی ﷺ ہے، مگر عشق رسول ﷺ سے سرشار ہونے کے باوجود انہوں نے بہت کم نعت کہی ہے۔ مجھے جو اس کی ایک سامنے کی وجہ نظر آتی ہے وہ ایک ڈر اور ایک خوف تھا کہ کہیں مدحت سرکار بیان کرتے ہوئے کوئی کمی نہ رہ جائے، یا صداقت کا مکمل اظہار نہ ہو پائے جس سے جانے انجانے میں شان اقدس ﷺ میں گستاخی کا ارتکاب ہو جائے، اسی لئے اساتذہ کی نعتیں پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ ان کی سرشاری کا وفور عجز سے مملو ہے۔ شاید اسی لئے غالب جیسے شاعر نے برملا کہہ دیا کہ

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم   کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمد است

میں سوچتا ہوں کہ جو سخنور مسلسل نعت کہتے ہیں یقیناً انہیں یہ توفیق ودیعت ہوتی ہے،

گویا یہ وہ چنیدہ لوگ ہیں جنہیں نعت خود چنتی ہے، جو ایک بار وادئ نعت میں قدم رکھتے ہیں، مدح رسول کے نئے افق نت نئے حوالے اور حیرتوں کے نئے مناظر انہیں اپنی طرف کھینچتے چلے جاتے ہیں، ان خوش نصیب چنیدہ لوگوں کے قافلے میں پورے عجز کے ساتھ بشریٰ فرخ بھی شامل ہوگئی ہے، غزل اور نظم کے کئی ایک شعری مجموعوں کی شاعرہ ویسے تو نعت بھی گاہے گاہے کہتی رہی مگر خود اس کو یہ علم نہیں تھا کہ مدحت رسول کے کہے گئے ان اشعار میں سے کسی نعت، کسی شعر یا کسی مصرع یا پھر شاید کسی ایک لفظ کو کسی سعد ساعت میں شرفِ قبولیت نصیب ہوا جو بشریٰ فرخ کے لئے نعت گوئی کا پروانہ لے کر آ گیا۔ پھر وہ نعت کہتی رہیں یا شاید یوں کہنا چاہیے کہ نعت نے اسے اپنے سایہ عاطفت سے بھگونا شروع کر دیا، وہ بھیگتی رہیں نعت ہوتی رہی اور ہو رہی ہے ایک نعتیہ شعری مجموعہ اس کے پڑھنے اور چاہنے والوں سے بشری فرّخ کی پر خلوص کاوش، بے کراں محبت اور بے بدل عقیدت سے ابھی خراج لے ہی رہا تھا، مگر وہ اس داد و تحسین سے بے نیاز وادئ نعت میں اپنا محبت اور عقیدت بھرا سفر جاری رکھے رہیں۔ اور اب وہ سرشاری کے ایک اور پڑاؤ پر ہے۔ اور یہ بھی پڑاؤ ہی ہے کیونکہ ایسا لگتا ہے کہ اس کی منزل آگے اور آگے ہے ابھی تو نعت رسول امیں ﷺ نے اس کی انگلی تھامی ہوئی ہے، سو اس وقت یہی کہہ سکتا ہوں کہ بشری جی! اسی احساس تفاخر سے خود کو بھگوتے ہوئے مدحت سرکار ﷺ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بناتی رہو۔ اور جاننے والوں کی طرح تمہیں بھی کہ ۔۔۔ ایں سعادت بزور بازو نیست۔

تو کجا من کجا

شاعرہ: بشریٰ فرخ

ہسدے وسدے رُوؤ جی

یہ ایک بہت مشکل اور ادق مشق ہے کہ آپ لفظوں سے متحرک تصویریں بنائیں اور پھر ان چلتی پھرتی نظر آنے والی تصویروں میں ایک خاص اٹکل سے مجلسی زندگی کے وہ رنگ بھریں جو بیک وقت دل اور آنکھوں کو اپنی گرفت میں لے لیں اور ان تصویروں سے ابھرنے والے خد و خال سے وہ کردار سامنے آئیں، جن سے دل و جان کے کئی رشتے استوار ہوں یا رہے ہوں یوں بھی اپنے ساتھ رہنے والوں کے بارے میں لکھنے کے سو سو بکھیڑے ہوتے ہیں کیونکہ ایسے کرداروں کی بات کرتے ہوئے مسلسل یہ احساس بھی دامن گیر رہتا ہے کہ کہیں کسی حرف سے محبتوں کے بے داغ شیشے میں بال نہ آ جائے، مگر دوسری طرف قلم کے قرض چکانے کے تقاضے یہ ہوتے ہیں کہ آپ نے ایک امانت اپنے ساتھ رہنے والوں اور اپنے بعد آنے والوں کو پوری دیانت داری سے سونپنی ہوتی ہے، گویا یہ رسّے پر چلنے کا سفر ہے ذرا احتیاط کی چھتری پر گرفت ڈھیلی ہوئی اور سفر تمام شد، تنویر سپرا نے اس کیفیت کی ایک بہت عمدہ تصویر کچھ یوں بنائی ہے کہ

اظہار کا دباؤ بڑا ہی شدید تھا
الفاظ روکتے ہی مرے ہونٹ پھٹ گئے

میں جب ڈاکٹر امجد حسین کے خاکوں کے مجموعہ ''ہسدے وسدے لوگ'' کے ساتھ رہ رہا تھا تو مجھے ڈاکٹر امجد حسین کے کمال فن کا قائل ہونے میں ذرا بھی دیر نہ لگی کیونکہ خاکہ نگاری کوئی سہل کام نہیں ہے اس میں نہ تو کسی کی سوانح حیات لکھنا مقصود ہوتا ہے اور نہ ہی کسی کا کوئی لمبا چوڑا قصیدہ تحریر کرنا ہوتا ہے یہ محض کسی بھی پسندیدہ شخصیت کی زندگی برتنے کی جھلکیوں پر مبنی وہ تصویر ہوتی ہے جسے سٹروکس کی مدد سے بنایا جاتا ہے مختصر لکھنا کتنا مشکل کام ہے اس کا اندازہ اچھے خاکے پڑھ کر آسانی سے ہو جاتا ہے یہ غیر افسانوی صنف ہونے کے باوجود شعر اور افسانہ کی طرح کا ایک ایسا تخلیقی کام ہے جس میں اشاروں کنایوں سے کام لیا جاتا ہے، ڈاکٹر امجد حسین نے ان خاکوں میں قلم کو کہیں من مانی نہیں کرنے دی صرف اُتنی بات لکھنے کی اجازت دی جتنی ضروری تھی، ااس لئے ان کا قلم کہیں بھی '' من شاہِ جہانم'' کا نعرہ لگاتا نظر نہیں آتا۔ اور جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ ہنر آتے آتے ہی آتا ہے، مانو خاکہ نگاری رابرٹ لوئیس سٹیونسن کی فرام ریلوے کیرج نامی نظم کا وہ مصرعے ہیں جس میں ٹرین کے بارے میں کہا گیا ہے' کہ پلک جھپکتے میں رنگین سٹیشنوں سے سیٹی بجاتی ہوئی نکل جاتی ہے۔ ڈاکٹر امجد حسین کے لکھے ہوئے خاکوں کے اس مجموعہ میں پچاس خاکے ہیں، اور پچاسواں خاکہ سب سے طویل ہے جو کم و بیش ایک سو چھیانوے صفحات پر محیط ہے، ڈاکٹر امجد حسین کا طرز تحریر بلا کا دلنشیں ہے اور بہت کم تحریریں قاری سے خود کو پڑھوانے کے فن پر دسترس رکھتی ہیں ایسی ہی جادوئی تحریروں میں ہسدے وسدے لوگ کے خاکے بھی ہیں، ڈاکٹر امجد نے ماضی میں کچھ وقت افسانے کی گلی میں بھی گزارا ہے اور اس کے در و دیوار اب اس کو ہانٹ کرتے ہیں اس لئے ان کے بہت

سے خاکوں کو ایک عمدہ کہانی کے طور پر بھی پڑھا اور پرکھا جا سکتا ہے، بطور خاص مجھے تو جانی گلہ اور میکڈانلڈ ہربرٹ شاہ کی آخری سطروں نے اسی طرح چپ کرا دیا ہے جس طرح کرشن چندر، او ہنری اور موپساں کے کئی افسانوں کے اختتام پر میں چپ ہو جاتا ہوں۔ میں جب گلزآر کے کچھ افسانے اور بہت سی فلموں کے کرداروں اور بطور خاص فلم موسم کے کرداروں کو ایک دوسرے سے بات چیت کرتے سنتا ہوں اس الجھن کا شکار رہتا ہوں کہ ان میں کس کردار کو موردالزام ٹھہرا کر اس کے خلاف ہو جاؤں اور کس سے ہمدردی کرتے ہوئے اس کا طرفدار ہو جاؤں اسی طرح ان خاکوں کے کچھ کرداروں کے حوالے سے بھی میں سوچتا ہوں کہ ان کی بظاہر منفی حرکتوں کو نظر انداز کر دوں ان سے نفرت کروں ان پر ترس کھاؤں یا پھر یہ سوچ کر بلا تبصرہ رہنے دوں کہ ان کو قدرت کی طرف سے شاید یہی کردار ادا کرنے کے لئے ہی بھیجا گیا، اس کے باوجود میں محسن احسان کے بارے میں احمد فراز کے دی نیوز اخبار میں کچھ کمنٹس پڑھ کر فرآز کی سفا کی کو بمشکل ہضم کر پایا تھا لیکن پھر مجھے محسن احسان سے لیا گیا وہ انٹرویو بھی بہت یاد آیا جو میں نے احمد فراز کی وفات کے بعد ان سے اپنے ادبی صفحہ ادب سرائے کے لئے لیا تھا جس میں انہوں نے فرآز کے حوالے سے پہلی بار بہت کھل کے گفتگو کی تھی یعنی ''حسابِ دوستاں در دل'' نہیں رکھا تھا اسی بنا پر میں نے وہ انٹرویو شائع نہیں کیا، مگر میں سمجھتا ہوں کہ خاکہ نگاری میں یہ سب ضروری ہوتا ہے جس طرح سعادت حسن منٹو نے نواب کاشمیری کے خاکہ میں نواب کاشمیری کے فن کو خراج تحسین تو خوب پیش کیا مگر خاکہ کے آخر میں ان کی بیگم کی خودکشی کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ نواب کاشمیری کی بے اعتنائی کی وجہ سے ان کی بیگم نے خود پر مٹی کا تیل چھڑک کر خود کو

نذر آتش کیا تھا اس لئے خا کہ کا اختتام کرتے ہوئے منٹو نے لکھا ہے، نواب کاشمیری لاکھ بڑا اداکار سہی مگر سکرین پر اسے پرفارم کرتے ہوئے دیکھ کر نہ جانے مجھے گھانسلیٹ کی بو کیوں آنے لگتی ہے۔اس مجموعہ میں جن خاکوں کی بات ڈاکٹر امجد نے اپنی بات میں کی یعنی رہٹ اور فٹ بال ان خاکوں نے مجھے بھی عجب لطف دیا اور ایک طرح سے خاکہ نگاری کی صنف میں کام کرنے والوں کو ڈاکٹر امجؔد نے ایک نئی اور عمدہ راہ سجھائی ہے، قلم قبیلہ کی جن شخصیات پر انہوں نے لکھا کمال لکھا ہے خصوصا عابد علی سیّد اور گرو جی ستیہ پال آنند کے خاکے بہت دلچسپ ہیں، ستیہ جی کے خاکے میں ضمن میرا بھی ذکر آیا ہے، یہ تب کی بات ہے جب غزل کے حوالے سے اپنی تمام تر مخالفت کے باوجود انہوں نے کسی شعری نشست میں غلام احمد قاصر کی غزل کے شعر پڑھے تھے مجھے یاد ہے کہ مجھے ڈاکٹر امجد حسین نے ایک ای میل بھی کی تھی اور اس واقعہ کے بارے میں ہاتھ ہولا رکھنے کا کہا تھا، البتہ ٹولیڈو میں ڈاکٹر امجؔد کے گھر ستیہ جی سے ملاقات بہت دوستانہ اور خوشگوار ماحول میں ہوئی تھی، پھر ارشاد صدیقی اور ڈاکٹر امجد کی دیکھا دیکھی میں نے بھی انہیں گرو جی کہنا شروع کر دیا تھا مگر ایک دن ڈاکٹر امجد کے گھر میں جب میں نے ارشاد صدیقی اور خالد رؤف کی موجودگی میں ان کی کتاب کتھا چار جنموں کی جو ان ہی دنوں شائع ہوئی تھی کے حوالے سے ایک چھوٹی سی چوک کی نشان دہی کی تھی تو انہوں نے مجھے ان کی موجودگی میں کہہ دیا تھا کہ آپ تو مجھے گرو جی نہ کہیں۔لیکن ستیہ آنند جی عالم اور بڑے صاحب مطالعہ آدمی ہیں اور ان کا کام کسی کو بھی احساس کم مائیگی میں مبتلا کر سکتا ہے، یہی بات میں ڈاکٹر امجد حسین کے بارے میں بھی بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں، آخری بات کچھ خاکوں تو بہت دیر تک مجھے اپنی

گرفت میں رکھے رہے ایسے خاکوں میں ''فقیر کی ماں'' سرفہرست ہے کیوں کہ یہ میرے دل کو کہیں بہت اندر سے چھونے والا اب تک تیسرا خاکہ ہے پہلے دو خاکے رشید احمد صدیقی کا کندن اور مولوی عبدالحق کا نام دیو مالی ہے، سو یہی کہوں گا کہ آغا جی

!ہسدے وسدے رہو،

ہسدے وسدے لوگ

مصنف: ڈاکٹر امجد حسین

قطرے سے گہر ہونے تک

سیانے کہتے ہیں کہ شاعری کی دیوی کم کم لوگوں پر مہربان ہوتی ہے۔اور ہو بھی جائے تو مسلسل ریاضت کی متقاضی ہوتی ہے۔جس کے بعد اس کی طرف سے قبول عام کی سند جاری کی جاتی ہے۔اس بات سے یقیناً انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔لیکن یہ بات بھی مسلمہ ہے کہ بنیادی طور پر ہر شخص کے اندر ایک شاعر موجود ہوتا ہے۔کوئی اسے جلد دریافت کر لیتا ہے۔کوئی اس عمل میں خاصا وقت لیتا ہے اور کچھ کو تو دم آخر تک اس کا علم نہیں ہوتا۔مگر اس بات کی صداقت میں اس لئے کلام نہیں کہ اگر کسی بھی شخص کو بچے کے چہرے پر مسکراہٹ خوش کر دیتی ہے۔یا بہار کی پہلی پہلی بارش اس کے دل کی کلی کھلا دیتی ہے یا پھولوں کی خوشبو اس کے مشامِ جان کو معطر کر دیتی ہے یا پھر ندی کی ہنسی، جھرنوں کی سرگوشی اور دریا کی سرمستی اس کے دل میں گدگدی پیدا کر دیتی ہے۔تو وہ مان لیں وہ شاعر ہے، شعر کہنا بعد کی سرگرمی ہے۔کوئی شعر کہتا ہے یا کوئی شعر نہیں بھی کہتا مگر جسے یہ ملکہ ودیعت ہو جائے اور وہ پوری یکسوئی کے ساتھ اسے ایک سنجیدہ سرگرمی کے طور پر بسر کرنے لگ جائے تو شعر کی دیوی کو اس کی اس پرارتھنا کے بعد مہربان ہونے میں ذرا دیر نہیں لگتی۔محمد نواز صابر کے اندر یہ ہلچل بہت پہلے ہی اپنے ہونے کا احساس جگا چکی تھی تاہم اسے اس سے دوستی میں دیر لگی۔اس کی اپنی ایک الگ

دنیا تھی جس میں وہ خالق حقیقی اور اس کی مخلوق کے درمیان رابطہ بحال کرنے کے لئے کوشاں تھا اور اب بھی ہے۔ کچھ ہی دن ہوئے ہیں کہ ہائیکو کی صورت میں اس کی طرف سے شاعری کا پہلا خوشگوار جھونکا آیا۔ اور اب وہ غزل نگری کی یاترا کو نکل پڑا ہے۔ اس کے کیسے میں غزل کی روایت اور اساتذہ کا مطالعہ پڑا ہوا ہے۔ اور وہ اسی اثاثہ کی روشنی میں شعر بن رہا ہے۔ غزل کی روایت سے جڑے رہنا بہتر ہے لیکن ''کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے'' کیونکہ اب شاعری نئی فضاؤں میں سانس لے رہی ہے۔ نیلے آسمان کے نیچے زندگی تازہ بکھیڑوں میں الجھ چکی ہے۔ اور شاعر ہی تو ہے جو اس کی ڈھارس بندھوائے ہوئے اس کے دکھ سکھ میں پورے کا پورا شریک ہو سکتا ہے ویسے آج کی شاعری چاہتی بھی یہی ہے کہ کوئی میرے پاس آئے تو پورے کا پورا آئے۔ مانو یہ ایک ایسا معبد ہے جہاں ایک لمحہ کو سب کچھ بھلا کر اپنے آپ سے ملاقات کا لطف لیا جا سکتا ہے۔ اور خود سے ملنے کے بعد بہت سے کام بہت آسان ہو جاتے ہیں۔ شاعری نے محمد نواز صابر کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے۔ دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک۔

مارچ 2016ء کی 11ویں صبح

ایوانِ غزل

شعری مجموعہ نواز صابر

ادبی کمٹمنٹ

یادش بخیر کوئی چار دہائیاں یا شاید اس بھی زیادہ پہلے کا پشاور اور اس کی ادبی فضا کی متحرک تصویریں اس وقت آنکھوں میں عجیب بھیگی سی دھند بھر دیتی ہیں جب اس سنہرے دور سے جڑی ہوئی کوئی یاد حرف ولفظ کا پیراہن پہنے ملنے آجاتی ہے، ہر زمانہ اپنے ستارے اپنے ساتھ لے کر آتا ہے۔مگر ان میں سے بہت سے آسمانِ ادب پر اپنے حصے کی روشنی پھیلا کر ٹوٹ جاتے ہیں، مگر ایسے ستارے بھی ہیں جو ستم ہائے روزگار اور گردش ماہ وسال سے بے نیاز کارِادب کو عبادت سمجھتے ہوئے ادب کے معبد سے باہر نہیں نکلتے۔

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

اور پشاور کا قلم قبیلہ اس لحاظ سے بہت ثروت مند ہے کہ ستر اور اسّی کی دہائی میں جو نوجوان قلمکار اس کا حصّہ بنے ان میں سے اکثر ابھی تک پوری کمٹمنٹ اور توانائیوں کے ساتھ اپنے حصے کی شمع جلائے ہوئے ہیں' جس زمانے میں ادارہ علم وفن کی ادبی نشستیں پشاور کے نوجوان قلمکاروں کی ادبی تربیت کر رہی تھیں، اس تربیت نے ہی جن بہت سے نئے لکھنے والوں کو پورے قد سے کھڑا ہونے میں مدد بھی دی اور اعتبار

بھی دیا۔ان میں سے ایک اہم نام ہندکو، فارسی اور اردو کی شاعرہ اور سفر نامہ و افسانہ نگار قدسیہ قدسی بھی ہیں، قدسیہ قدسی ایک تواتر سے نہ صرف ادبی مجلسوں میں شریک رہیں بلکہ زندگی میں آنے والے بہت سے نشیب و فراز سے گزرنے کے باوجود کار ادب سے ایک لمحہ غافل نہیں رہیں اور اپنے پڑھنے والوں کو شعر و افسانہ کے مجموعے اور سفر ناموں کے تحائف دیتی رہی، شہر ہفت زبان پشاور کی رہنے والی اس طرحدار قلمکار کی اب تک ہندکو افسانوں کے مجموعہ ''کنڈے کنڈے وادی'' اور فارسی شعری مجموعہ سمیت اردو میں شعر و سفر نامہ کی کئی کتب شائع ہو چکی ہیں، وہ مسلسل قلم کا قرض ادا کر رہی ہیں، اور اب اپنے تازہ شعری مجموعہ میں جہاں گرد و پیش کے کئی ایک سماجی اور کسی حد تک سیاسی مسائل کو اپنی نظموں اور قطعات کا موضوع بنایا ہے وہاں ان اساتذہ اور ادبی زعما کی محبت کو بھی خراج پیش کیا جو اپنے حصہ کا کارِ ادب کر کے ہم سے بچھڑ گئے ہیں، میں ان کے وفور، احساس اور جذبے کو ایک سعد سرگرمی سمجھتا ہوں، اس لئے ان کی نظم کے فنی پرکھ پرچول پر بات کرنے کی بجائے ان کی نظموں میں گندھے ہوئے حالات حاضرہ اور معاشرتی موضوعات کے چناؤ کے لئے ان کی اس کاوش کو قدر کی نظر سے دیکھتا ہوں۔

2021 کی فروری کی 27 ویں صبح

دفینۂ خزینہ

شعری مجموعہ قدسیہ قدسی

قصہ خوانی ایک البم

کسی بھی زبان کے شعری یا نثری ادب کو دیکھا جائے تو بڑے اور معتبر ناموں کی ایک فہرست ہر دور میں نظر آتی ہے لیکن اگر ایسے تخلیق کاروں اور قلمکاروں کا تذکرہ مقصود ہو جن کو نظم اور نثر دونوں پر عبور حاصل ہو تو سارے ادوار مل کر بھی کوئی لمبی فہرست ترتیب نہیں دے سکتے۔ کیونکہ قدرت کی طرف سے بہت کم قلمکاروں کو یہ دولت تخلیق ودیعت ہوتی ہے اور جن کو یہ عطا کی گئی ہوتی ہے ان کے بارے میں معاصر یہی کہتے ہیں کہ کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہ اپنی تمام تر توجہ کسی ایک صنف کی طرف مرکوز کرتے تو آج فلاں فلاں ہوتے اور یہ حد جاری کرنے سے پہلے وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ عطیۂ خداوندی یہ صلاحیت یہ توفیق بزور بازو نہیں حاصل کی جاسکتی ۔تا نہ بخشند خدائے بخشندہ۔اور اگر ہم ادب کی مختلف اصناف میں فکر سخن کرنے والوں کی کوئی فہرست ان زبانوں کے حوالے سے مرتب کریں جن زبانوں کو ابھی لکھت کی دنیا میں آنکھ کھولے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں تو پھر دو اڑھائی ناموں کے بعد خلاؤں میں گھورنا شروع کر دیتے ہیں ان دو اڑھائی ناموں کی فہرست کی زبان ہندکو ہے۔ ہندکو جسے بولے جانے کے حوالے سے تو ایک قدیم ترین اور ویدوں میں مذکور زبان کی حیثیت حاصل ہے مگر لکھی جانے والی زبان کے طور پر نصف صدی پیشتر تک بھی ادب کی کسی صنف کو

اپنے دامن میں جگہ دینے کے حوالے سے یاد نہیں کیا جا سکتا۔ سینہ بہ سینہ شعری سرمایہ بھی نسل در نسل منتقل ہوتا رہا اور لوک داستانوں کو بھی زبانی کلامی برتا جاتا رہا۔ گویا اب تک ہندکو زبان میں جتنا کام بھی ہزارہ کوہاٹ ڈیرہ اسماعیل خان یا پشاور میں ہوا وہ گزشتہ نصف صدی کی دین ہے۔ ایسے میں کسی ایسے قلمکار کا ذکر کرنا، جو بیک وقت شاعری افسانہ نگاری' ناول نگاری، خاکہ نگاری ڈرامہ نگاری تراجم انشائیہ اور کالم نگاری کے شعبوں میں یکساں سہولت سے رواں ہو، کتنا دل خوش کن احساس اور خوش گوار فریضہ بن جاتا ہے میری اس سرشاری اور خوشی کا باعث پروفیسر حسام حر ہیں جو نہ صرف ہندکو بلکہ اردو زبان میں بھی شعری اور نثری افسانوی ادب کے کوچے کی ایک معتبر آواز ہے میں ان لوگوں سے زیادہ متاثر ہوتا ہوں جو کبھی کسی پلیٹ فارم پر یا نجی محافل میں دوسروں کو متاثر کرنے کی کوئی شعوری کوشش نہیں کرتے اور اپنے آپ کو ''لو پروفائل'' میں رکھنا پسند کرتے ہیں۔ یہی حال حسام حر کا بھی ہے کہ نہ صرف تخلیقی سطح پر ایک زرخیز ذہن کے مالک ہیں بلکہ مطالعہ اور بہت سا مطالعہ کے حوالے سے اپنے گردو پیش کے احباب میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ پڑھتے ہیں، لکھتے ہیں مگر کم بولتے ہیں اور یہی بات انھیں سطحی مقبولیت سے دور رکھے ہوئے ہے وہ جو بولتے ہیں اورا پنے حق میں بولتے ہیں بزعم خود اونچے سنگھاسن پر براجمان ہو جاتے ہیں مگر جن کو بھلانے میں وقت ذرا دیر بھی نہیں لیتا۔ کہ وقت خود ایک فلٹر ہے چھلنی ہے ماضی قریب میں جھانکیں تو مثال ڈھونڈھنے میں دقت نہیں ہوگی۔ حسام حر میں بلا تکان کام کرنے کی جو صلاحیت ہے اس کے لئے افراد نہیں ادارے بھی ترستے ہیں۔ ہندکو کی بات کی جائے تو ایک لمحہ کو دیکھیں تو کون مانے گا کہ ادبی محافل کی آخری صف میں بیٹھا یہ شخص

ہندکو زبان کا پہلا ناول نگار ہے ہندکو زبان کے افسانوں کے پہلے مجموعے کے یہ خالق ہیں۔سب سے پہلے علامہ اقبال کو ہندکو میں ڈھالنے والے (اور اب تک آخری بھی) یہ مترجم ہیں۔ ہندکو زبان میں بے لاگ خاکہ نگاری کی ابتدا کرنے والے یہی جیالے ہیں۔ ہندکو زبان میں اخبار ہفت روزہ اور پھر ماہنامہ نکالنے والے یہ ایک طرح دار مدیر ہیں بلکہ اپنے پشتو قلمکار دوستوں کو اپنے ساتھ ملا کر ہندکو۔پشتو میگزین کی بنیاد رکھنے والے یہ صلح کل شخص ان احباب کو مسلسل اس بات پر آمادہ کر رہے ہیں کہ ادبی حوالوں سے کام کے ساتھ ساتھ سماج سدھار فورم کے لئے بھی کام کریں۔وہ صرف اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر چائے کی پیالی میں طوفان نہیں اٹھاتے۔وہ مسلسل قلم کے محاذ پر ان عناصر کے خلاف جنگ لڑ رہے ہیں جو اس کے سماج کو بدصورت بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔قلم کے یہ سپاہی ایسی لکھتیں لکھتے وقت صرف ٹارگٹ پر نظر رکھے ہوئے ہوتے ہیں، انھیں اظہار کے لئے دونوں زبانوں پر عبور عطا ہوا ہے جسے وہ برت رہے ہیں۔قصہ خوانی بھی اسی حساس شخص کے دل سے نکلنے والی آہوں اور نوحوں کی تفسیر بھی ہے اور ان کے غصہ، بے بسی اور بے کسی کی قلبی تصویر بھی ہے۔ یہ وہ بازار ہے جہاں معاشرے کے زخموں کی نمائش لگی ہوئی ہے وہ البم ہے جس کی ہر تصویر اپنے لوگوں اپنے شہروں اور اپنے معاشرے سے مکمل کمٹمنٹ کی اجلی اور شفاف لکھت سے عبارت ہے۔

قصّہ خوانی

کالم نگار حسام حر

خوش آمدید

یہ جو شعر و ادب کی ریاست کی اونچی فصیلوں پر چوکس چوبدار کھڑے ہیں انہوں نے تصانیف کی قبولیت اور پذیرائی برائے ادب کے بڑے کڑے معیار مقرر کر رکھے ہیں۔ میری رائے میں تو، دیکھنا یہ چاہیے کہ کیا لکھا ہوا کوئی ایک لفظ بھی پڑھنے والے سے مکالمہ کرتا ہے، اس کے شب و روز میں تبدیلی لاتا ہے، پڑھنے والے کی ذہنی و قلبی کیفیات کی کایا پلٹتا ہے، اس کے لائف سٹائل میں مثبت تبدیلی لاتا ہے نہیں۔ اگر کسی بھی تصنیف کی وجہ سے کسی کی تہذیبی زندگی میں ذرا سا بھی مثبت بدلاؤ آتا ہے تو میرے خیال سے اسے قصرِ ادب میں ایک گوشہ مہیا کر دینا چاہیے۔

اس تمہید کے بعد عرض یہ کرنا ہے کہ میرے پیش نظر، آپ کے ہاتھوں میں موجود ڈاکٹر انتخاب عالم کی کتاب ہے۔ اس کا موضوع تو سیدھا سا داطب سے متعلق ہے، بیماریاں، ان کی حقیقتیں، مفروضے، ان کی تشخیص اور ان کا علاج اور اسی حوالے سے طبی معلومات جس کا بظاہر ادب سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اتفاق سے اُردو زبان میں حکما کی کتب تو بہت سی موجود ہیں اور ان کے پڑھنے والوں کا ایک وسیع حلقہ بھی موجود ہے مگر سچی بات یہ ہے کہ وہ عام فہم نہیں ہیں اور ایک عام آدمی کی سمجھ سے قطعی بالاتر ہیں۔ اسی لئے عام طور پر طب کے متعلق مضامین کے قارئین کا حلقہ مخصوص لوگوں تک ہی

محدود رہا۔

تاہم ڈاکٹر انتخاب عالم کی یہ تازہ تصنیف اس لحاظ سے بہت اہمیت کی حامل ہے کہ اس کتاب میں طب کے پیچیدہ اور مشکل مضامین کو انتہائی دلکش، سلیس، آسان اور عام فہم زبان میں لکھا گیا ہے، جس کی وجہ سے انتہائی اہم طبی معلومات، کسی معالج کی مدد کے بغیر ہی، ایک عام آدمی تک با آسانی پہنچ جاتی ہیں۔ مجھے اس کا مسودہ پڑھتے ہوئے ایک گونہ لطف بھی آیا اور اپنی بہت سے عادتوں پر نظر ثانی کا موقع بھی ملا جو مختلف بیماریوں کو اپنانے کی ترغیب دلا رہی تھیں۔ یہ کتاب آغاز ہی سے اپنے پڑھنے والوں کو ڈاکٹر انتخاب عالم کی انسان دوستی کا احساس دلا دیتی ہے اور اس کے بعد تو سارا کام محبت کا ہی رہ جاتا ہے، وہ محبت جو دلوں تک اپنا راستہ خود ہی بنا لیتی ہے۔ ڈاکٹر انتخاب عالم کو مریض ہی نہیں اپنے پیشے کے لوگ بھی تشخیص کا ایک ماہر جادوگر مانتے ہیں اور جس کی کچھ کچھ تائید خود ان کی یہ دلنشیں تحریر بھی کرتی ہے۔ یوں بھی اپنی از حد مصروفیات میں سے اس کار خیر اور صدقۂ جاریہ کے لیے وقت نکالنا نہ صرف ان کی انسان دوستی کا ثبوت بلکہ رب ذوالجلال کی خوشنودی حاصل کرنے کی ایک سعئ مبارک بھی ہے۔ جسے رب ذوالجلال اپنی بارگاہ میں قبول کرے اور یومِ آخرت میں اس کا پورا پورا اجر عطاء فرمائے۔ آمین۔

شعر و ادب کی ریاست کی اونچی فصیلوں پر کھڑے چوکس چوبداروں سے میری درخواست یہ ہے کہ وہ کم از کم ڈاکٹر انتخاب عالم کی اس کتاب کو ''طب کا معلوماتی ادب'' کے ٹائٹل کے ساتھ کم از کم قصر ادب کی انیکسی ہی میں داخل ہونے کا پروانۂ راہداری اس شرط پر جاری کر دیں کہ وہ اس سلسلہ کو اسی محبت کے ساتھ جاری رکھیں

گے۔ میں ڈاکٹر انتخاب عالم کو لکھنے والوں کی بزم میں خوش آمدید کہتے ہوئے اُمید کرتا ہوں کہ جس طرح وہ اپنے ہونٹوں کی دھیمی دھیمی مسکراہٹ کی لو کبھی مدھم نہیں ہونے دیتے اسی طرح لکھنے کے اس خوبصورت سلسلہ کو بھی بالکل اسی طرح آگے بڑھاتے رہیں گے اور اس اُمید کے ساتھ کہ وہ لوگوں سے محبت کی یہ شمع ہمیشہ روشن رکھیں گے میری دُعا ہے کہ اللہ کی ان کی توفیقات میں مزید اضافہ کرے۔ آمین

پشاور۔ 2016ء کے اکتوبر کی تیرھویں صبح

بیماریوں کی حقیقت

مصنف: ڈاکٹر انتخاب عالم

نئی بستیاں

یہ جو دور پار کے دیسوں میں اردو کی نئی ادبی بستیاں بنی ہوئی ہیں ان کے باسیوں کی فروغ ادب کے لئے شبانہ روز کی سنجیدہ کوششیں، فعال کردار، بے پناہ دلچسپی اور بڑے پیانے پر شاندار تقریبات کے انعقاد نے ادب کے بڑے مراکز اور دبستانوں میں کار ادب پر معترض ان چھٹ بھئیوں کے اس مفروضے کو تو غلط ثابت کر دیا کہ شاعری یا ادب ''شغل بے کاراں'' ہے، کیونکہ باہر کی دنیا کی مصروفیت تو ایک گھر میں رہنے والوں کی ملاقات بھی ویک اینڈ تک مؤخر رکھتی ہے۔اس کے باوجود ان نئی ادبی بستیوں میں نہ تو عمدہ تقریبات کے انعقاد کی کمی ہے، نہ سخن وروں کی اور نہ ہی شعرو افسانہ کے مجموعوں کی مسلسل اشاعت میں کوئی تعطل پیدا ہوتا ہے۔ دیارِ غیر کے ان بڑے ادبی مراکز میں ایک معتبر و مستند ادبی مرکز امریکہ کے شہر ہیوسٹن (ٹیکساس) میں بھی ہے، (سیّد احمد) شاہ غزالی اسی طرحدار شہر سے جڑا ہوا ایک بہت ہی متّحرک اور جیالا شاعر ہے، وہاں کی شعری نشستیں شاہ غزالی کی عمدہ اور جاندار نظامت سے ہی سجتی، سنورتی اور یادگار ٹھہرتی ہیں، غالبًا ان ہی مصروفیات کی بنا پر انہیں اپنے شعر کو ترتیب دینے کے لئے اپنی ''توجہ'' کا لمبا انتظار کرنا پڑا۔لیکن چاند سورج کی طرح شعری مجموعے کے طلوع کا بھی ایک وقت مقرر ہے، اور ''شگفتنِ گلہائے ناز'' کا یہ

وقت اب شاہ غزالی کے لئے ہے۔اس شعری مجموعہ کو پڑھتے ہوئے مجھے لگا کہ شاہ غزالی کا شعر اپنے پڑھنے والے سے بہت دھیمے،مہذب مگر پر اثر لہجے میں اپنا تعارف کرتا ہے، ہر شعر اپنے اندر ایک ایسی کہانی چھپائے ہوئے ہے جسے وہ بھاری بھرکم لفظوں یا ترا کیب سے معمہ بننے نہیں دیتے۔شعر جب تک شاعر کے لئے واردات نہیں بنتا قاری یا سامع سے بھی دوستی نہیں کرتا، اس لحاظ سے شاہ غزالی کے مجموعہ ''غزالیات'' کے ہر صفحہ پر ان کے سادہ مگر پر تاثیر شعر بار بار آپ کو روک لیتے ہیں،''کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است'' سیدھے سادے لفظوں میں بنے گئے ان کے مصرعے اپنے اندر بلا کی کشش رکھتے ہیں،

۔شہر والوں سے بات کر لی ہے،

۔میں نہ آباد نہ برباد ہوا

رات بھر جاگنا نہیں آساں

گرچہ پھر کوئی نہ آیا عمر بھر۔

پوری کہانی سناتے ہوئے ان مصرعوں کی طرح عمدہ اور بے ساختہ اشعار بھی پڑھنے والوں کو لمحوں میں شاہ غزالی کی پروازِ تخیل اور فکری اپج کا طرفدار بنا لیتے ہیں۔

اہل دل جس سے فیض پاتے ہیں
ہم فقیروں کا خانوادہ ہے

غزالیات

شاعر: شاہ غزالی

نہ ستائش کی تمنا

موجودہ میسر سہولتوں نے زندگی کو سہل کیا بنایا کہ تساہل ہماری طبیعت کی ترجیحات میں اونچے سنگھاسن پر جا بیٹھا۔سو دوسرے شعبوں کی طرح ادب میں بھی اس بات کا چرچا عام ہوا'' کہ شاعروں میں تن آسانیاں تو ہوتی ہیں'' اور ایسی تن آسانیاں کہ مقبولیت کی 'بے تاب تمنا' شعر اور فکشن کے تو انبار لگا دے مگر تحقیق وتنقید جیسی 'صبر طلب' اور ادق مشق کے بھاری پتھر کو چھونا اور چومنا تو درکنار، دیکھنا بھی میر درد کے محبوب کا سا ہو یعنی'' ایدھر کو نگہ کوئی پھینکی بھی، تو دزدیدہ'' اس لئے جب جواں سال و جواں فکر گوہر نوید کو میں تواتر کے ساتھ گلیمر کے برعکس تحقیق وتنقید جیسے بظاہر غیر دلچسپ کام میں دلچسپی لیتے دیکھتا ہوں، تو یک گونہ خوشگوار حیرت ہوتی ہے کہ 'یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی' اب کے اس رونوردِ نے ''خیبر پختونخوا میں اردو ادب'' کی شکل میں اُس کام کو آگے بڑھانے کا بیڑا اُٹھایا ہے جس کا نقش اوّل فارغ بخاری جیسا استادِ فن ادبیات سرحد'' کے نام سے اردو ادب کو دے چکا ہے۔اساتذہ کے چھوئے ہوئے کاموں کو اپنے زمانے تک لے کر آنے کے سو بکھیڑے ہوتے ہیں اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ تحقیق وتدوین اور تنقید کے شعبے میں تعصّبات سے بالاتر ہو کر، اپنی صوابدید کے مطابق، حقائق کو کتنا بھی بلا کم و کاست پیش کیا جائے، حقائق کی تلخی بسا اوقات

جانبداری اور دلآزاری کے الزامات کو جنم دیتی ہے لیکن 'نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا' کا خوگر گوہر نوید جب تعمیری اور تخریبی آرا سے بے نیاز سر جھکائے حقائق کی دریافت کے سفر پر نکلتا ہے تو۔۔سچ کہتا ہوں۔۔۔یہ لڑکا مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔

2020 کے پہلے مہینے کی آخری صبح

خیبر پختونخوا میں اردو ادب

مصنف: گوہر نوید

ایک تازہ کار ڈرامہ نگار

ایک زمانہ تک اردو ڈرامہ کو ادبی صنف تو کجا اسے کوئی فن شریف بھی ماننے کو تیار نہ تھا، چہ جائیکہ پاکستانی زبانوں کے ڈرامے مگر پہلے ریڈیو اور پھر ٹیلیوژن نے انہیں سینے سے لگایا اور مستند ادیبوں نے اسے اعتبار دیا، ایسے ہی قد آور اور معتبر ڈرامہ نگاروں میں پشتو کے طرحدار ڈرامہ نگار خالقداد امیدؔ بھی شامل ہیں کہ ایک زمانے میں پاکستان ٹیلیویژن کے ناظرین کو شدت سے ان کے معاشرتی طنزیہ اور مزاحیہ ڈراموں کا انتظار رہتا تھا، کتنے ہی سیریز ان کے کریڈٹ پر ہیں شاید خود ان کو بھی تعداد یاد نہ ہو، پی ٹی وی پشاور مرکز کے لئے ریکارڈ ساز سیریز دروغ ریشتیا، پہ تول پورہ، خیر پخیر سمیت ان گنت سیریز، سیریلز اور سنجیدہ ڈرامہ لکھے بھی اور بطور آرٹسٹ پرفارم بھی کیا، پھر ریڈیائی اور سٹیج ڈراموں کا تو شمار ہی نہیں، ان کا کام کسی بھی لکھاری کو کمپلکس میں مبتلا کر دیتا ہے، پھر ان کے اردو ڈرامے آنا شروع ہوئے جنہوں نے پشاور اور پاکستان کی حدود کو پھلانگ کر پوری اردو دنیا کو اپنا اسیر بنا لیا جب بہت اچھی شاعرہ، فکشن رائٹر، براڈ کاسٹر اور میری بہت اچھی دوست RJ الماس شمی کے پنچ ریڈیو USA سے ان کے ڈرامے آن ائیر گئے تو ان کی شہرت کو جیسے پر لگ گئے۔ خالقداد امید کی پہلی اور آخری محبت ان کی اپنی دھرتی اور اپنی مٹی ہے ان کی تحریر ہمیشہ اسی محبت کے مدار میں

رہتی ہے،اس لئے اس مجموعے میں شامل ایک ڈرامے میں ''تیس سال بعد وطن لوٹنے والے کردار کے لئے کسی دل میں محبت ہوتی ہے نہ ہمدردی اور نہ ہی کوئی اس کو رعایت دینے کو تیار ہوتا ہے'' مکالمہ بننے کا فن انہیں خوب آتا ہے،سادہ مگر پر تاثیر لفظوں سے بڑی بات بہت ہی سہولت سے کہہ جاتے ہیں، جیسے ''خواب میں پانی پینے سے کسی کی پیاس کب بجھتی ہے''۔خوش ہوں کہ وقت سے آگے سوچنے والے خالقداد امید نے مہ وسال سے ہار نہیں مانی وہ آج بھی تازہ دم،تازہ کار اور اپنے کام میں مگن ہیں۔ان کے چہرہ پر تھکن کے آثار نہیں کامیابی اور سرشاری کے اشتہار نظر آتے ہیں،سو کیپ اٹ اپ بڈی۔۔۔

(2018 جون کی 12 ویں سہ پہر)

لاڈلی

مصنف: خالقداد امید

انٹیک کار۔۔۔۔۔ایک عمدہ کوشش

کبھی کبھی سوچتا ہوں تو بہت حیران ہوتا ہوں کہ بچپن میں پڑھی ہوئی نصابی اور غیر نصابی کہانیاں ابھی تک نہ صرف مجھے یاد ہیں بلکہ ان کی معنویت اور افادیت میں گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ بھی ہو رہا ہے، اس کے باوجود میں یہ سمجھتا ہوں کہ گزشتہ کل کی نسبت آج بچوں کے لئے لکھنا اس لئے بھی بہت مشکل ہو گیا ہے کہ اب ان کی تفریح کے لئے بہت کچھ ان کے آس پاس موجود ہے، پھر ادب سے جڑے ہوئے دوستوں نے بچوں کے لئے لکھنے کو زیادہ توجہ نہیں دی مگر غنیمت ہے کہ اب نیشنل بک فاؤنڈیشن کی طرح کے کچھ ادارے اس خسارے کو کم کرنے کے لئے آگے رہے ہیں۔ جواں سال اور جواں فکر محقق، نقاد اور کہانی کار راج محمد آفریدی کے بچوں کے لئے لکھی ہوئی کہانیوں کے مجموعہ ''انٹیک کار' کی بارِ دیگر اشاعت اسی سلسلے کی ایک اہم اور عمدہ کوشش ہے۔ راج محمد آفریدی کی کہانیوں میں جہاں بچوں کی دلچسپی اور تفریح کے لئے بہت کچھ ہوتا ہے وہاں بچوں کی نفسیات اور ان کی ذہنی استطاعت کو مدنظر رکھتے ان کی غیر محسوس تربیت کا سامان بھی موجود ہوتا ہے انٹیک کار جیسی کتب کی اشاعت اور بچوں تک اسے پہنچانے سے یہ مشکل اور نازک کام آسان بنایا جا سکتا ہے۔

(نومبر 2022 کی 24 ویں سہ پہر)

انٹیک کار

مصنف: راج محمد آفریدی

شاعری اور موسیقی کا حسین امتزاج

ایک زمانے تک گیت ہندی زبان کے آنگن میں ہی کھیلتا رہا اور یہ خیال کیا جاتا کہ اس بالک کو بس ہندی لفظوں کا پہناوا ہی راس رہے گا، اس لئے دیر تک ادبی اصناف میں اس صنف کو پروانۂ راہداری نہیں مل سکا۔ دیکھا جائے تو ایک طرف امیر خسروؒ کے کلام کو غزل کہا جاتا رہا جو کلام غزل سے زیادہ گیت کے بہت قریب تھا اور ہے۔ دوسری طرف علاقائی زبانوں کا سارا سرمایہ لوک گیت یعنی فوک لور ہے، جس میں سرفہرست لوری ہے۔ مگر ادب کے کچھ تھرڈ دلے نقادوں نے اس صنف کو شہرِ ادب میں داخل ہونے نہیں دِیا۔ مجھے اجازت دیں کہ میں یہ کہہ سکوں کہ جب مغربی ادب کے اثرات ہمارے اردو ادب پر مرتب ہونا شروع ہو گئے تو ادب کو کھلی فضا میں سانس لینے کا موقع ملا اور نظموں کے موضوعات میں تبدیلی آ گئی۔ شاعری میں مناظر فطرت کی عکاسی کی وجہ سے قومی نظموں اور گیتوں کو بھی خوش آمدید کہا جانے لگا، اردو زبان و ادب نے جب گیتوں کو سینے سے لگایا تو علاقائی زبانوں کے گیتوں کو بھی اعتبار مل گیا پھر وہ گیت سینہ بہ سینہ صرف شادی بیاہ اور موسمی تہواروں تک محدود نہ رہے، بلکہ کاغذ قلم کے راستے کتابی صورت میں آنے والے زمانوں کے لئے محفوظ ہونے لگے، بعد کے زمانوں میں ڈرامے، ریڈیو اور فلموں نے بھی گیتوں کو مقبول بنانے میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا،

اردواور باقی زبانوں میں تو گیتوں کے مجموعے آ گئے، لیکن ہندکو کی میٹھی زبان کی طرف دوستوں نے کم توجہ دی ہے۔ مجھے جب اردواور پنجابی زبان کے بڑے نامور، معتبر اور مقبول گیت نگار سعید گیلانی کے ہندکو زبان کے گیتوں کے مجموعے کا مسودہ دیکھنے کا موقع ملا تو میرے لئے وہ لمحہ بہت ہی خوشی اور اطمینان کا تھا، ایک طرف ہندکو گیت اور سٹھنیوں کو اردو پنجابی اور ہندکو زبان وادب کا ایک بڑا شاعر افسانہ نگار اور دانشور میسر آ گیا تو دوسری طرف ہندکو گیت کو آنے والے وقتوں کے لئے گندھارا بورڈ اور گندھارا ہندکو اکیڈمی اس صنف کو کتابی شکل میں محفوظ کر رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ گیت خانہ دار خواتین کے جذبات کو تصویر کرنے کا نام ہے، پھر صوفیائے کرام نے عشق حقیقی میں خود کو عاشق اور صنف نازک بنا کے خالق حقیقی کو محبوب سمجھ کے جو شاعری کی ہے وہ بھی در اصل گیت کا ہی انگ ہے۔ لیکن ڈرامے اور فلموں نے اس تصور کو برقرار نہیں رکھا اور پھر گیت لکھنے والوں نے مرد کے جذبات واحساسات کو بھی اِسی پیرایہ میں اظہار دے کے گیتوں کی دنیا میں ایک نیا باب کھول دیا۔ اور اب اگر سعید گیلانی اپنے پیارے لب و لہجے میں ہندکو زبان کی دلہن کے ہار سنگھار اور جیت ہار کے قصے چھیڑتا ہے تو ہندکو گیت اور ہندکو وان نوجوان کو بھی زبان، لہجہ، رچاؤ اور اس کے جذبات کو اعتبار دیتا نظر آتا ہے۔

جیڑی گہل سے ڈرنا ایاں، آخر او گہل ہوئی
چوری چوری آ کے بنڑیا دل دی تہڑکن کوئی
منوں منڑی پے گئی یار غلطی اکھیاں دی
سارے کہندین جس نوں پیار غلطی اکھیاں دی

منوں کرگئی روگی یار غلطی اکھیاں دی

سنی لکڑی ہاراوتخ دے نہ بجھ دے نہ سڑ دے

میرے وانگر روؤن جیڑے عشق اسکول اچ پڑھدے

ہونڑ بنڑگئی میری ہار غلطی اکھیاں دی

سارے کہندین جس نو......

سعید گیلانی کی طرح مستند گیت لکھنے والے سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے کہ گیت احساس کی شدت اور داخلی جذبات کے مختصر اظہار کا نام ہے۔جس میں غنائیت اور ترنم کو بنیادی حیثیت حاصل ہے،اس لئے مجھے سعید گیلانی کے اس مجموعے میں ان کے بیشتر گیت مترنم لفظوں کی زبانی پر جوش جذبے کو اپنے پڑھنے اور سننے والوں تک پہنچاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پھر غزل کے برعکس گیت میں ایک ہی جذبہ کی عکاسی ہوتی ہے اور دیکھا جائے تو ایک وقت میں انسان ایک ہی جذبے کے زیراثر ہوتا ہے۔سعید گیلانی کے گیت سیدھے سادے انسانی جذبات کا اظہار کرتے وقت نہ مبالغہ کا شکار ہوتے ہیں نہ تصنع کا اور نہ ہی لفظوں کی بازیگری کا شکار ہوتے ہیں اس لئے نہ ہی یہ گیت اور نہ ہی ان کی فضا پڑھنے والوں کو اجنبی یا پرائی سی لگتی ہے۔

اکھیاں نل تو کرنی ایں گلاں ہوٹھ تیرے چپ رہندے ون

دیکھ کے تیریاں شوخ اداواں، پیار پلیکھے پیندے ون

جدوانگلاں اتے نچاویں

پلکاں دے تیر چلاویں۔۔۔۔ساڈے دلاں

یا پھر اس گیت کی رومانی فضا کو دیکھیں کہ سعید گیلانی کس طرح پیار کی خوبصورت اور

مترنم تصویریں بناتے ہیں اِس گیت کی استھائی ہے کہ

کدی ایہہ کہساں، کدی اوہ کہساں

کدی بول پیساں کدی چپ رہساں

تیرے آنڑے سی پہلے۔ دل نوں میں ہر گہل سمجھانی آں

پر توجس ویلے سامنڑے آنے، ہر گہل میں پہل جانی آں

اس گیت کے سارے انترے اسی رنگ انگ اور رچاؤ' میں شرابور ہیں، اور صرف یہ نہیں اِس طرح کے گیت ان کے گیتوں کے مجموعہ کے ہر صفحے پر اپنی بہار دکھلا رہے ہیں۔ سعید گیلانی نے ہندکو سٹھنیوں کے ورثے کو بھی ایک نئے ذائقہ کے ساتھ متعارف کروا کے ماں بولی کا ایک اور قرض بھی اُتار دیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ سعید گیلانی کے ہاتھ میں قلم کی بجائے بانسری ہے اور جب وہ سر چھیڑتا ہے تو سننے والے ناچ اٹھتے ہیں اور سینے میں دل کی دھڑکنیں دھمال ڈالنا شروع کر دیتی ہیں۔

دوستو مجھے یقین ہے کہ آپ سعید گیلانی کے اس خوبصورت اور پیارے مکھڑے والے تحفہ کے ساتھ اپنے دل کی دنیا میں ایک نئی خوشبو اور رنگ محسوس کریں گے کیونکہ سعید گیلانی کے یہ گیت شاعری اور موسیقی کا بے حد حسین امتزاج ہیں۔ سعید شاہ جی، آپ کا بہت شکریہ۔

ڈینور۔ کولوراڈو (امریکہ) سال 2018 کی جنوری کی 7 ویں شام

پپل وترے

مصنف سعید گیلانی

(ہندکو دیباچہ سے ترجمہ)۔۔اویس خیال

دوسرا پڑاؤ۔۔۔تعبیراں

دنیا اک عالمی گاؤں بن سکی یا نہیں مگر اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ہم بیک وقت کئی زبانوں میں سانس لے رہے ہیں، ایک شہر پشاور کی مثال لے لیں تو کبھی یہ ہفت زبان شہر کہلاتا تھا اور یہاں کے وسنیکوں کا عمدہ ذوق اور اسلامی شعائر ان کو فارسی عربی کی کتابوں کے ساتھ بچپن سے ہی دوستی کروا دیتے تھے۔ ماں بولی ہندکو تو خیر گھٹی میں پڑی تھی اور سکولوں کالجوں میں اردو انگریزی فارسی عربی سے بھی واسطہ رہتا تھا۔ شہر کے آس پاس کی ایک بڑی زبان پشتو کا اثر بھی یہ شہری وسنیک لیتے اور اٹک پار سے آنے جانے والوں کی زبان پنجابی کے اثر رسوخ کو بھی ''جی آیاں نوں'' کہنا روزمرہ میں شامل تھا۔ پھر یہ بھی تھا کہ ہندکو کے مختلف لہجے بھی سیکھنے بولنے پڑتے تھے کہ ان سے بھی روز واسطہ رہتا تھا۔ ان میں ہندکو کا کوہاٹی لہجہ، ہزارے وال لہجہ، ڈیرہ جاتی ہندکو اور سرائیکی سمیت کئی اور زبانیں اگر چہ بولی کم کم جاتیں مگر سمجھی ضرور جاتی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود ہر زبان کا اپنا لہجہ، اپنا ذائقہ اور اپنی مٹھاس محفوظ تھی۔ پھر سکول کالج میں پڑھنے والے عموماً اور کاروباری طبقہ خصوصاً کچھ کچھ اپنی ضرورت اور کچھ کچھ فیشن کے مارے اپنی گفتگو میں اردو انگریزی کا تڑکہ لگانے لگا۔ وقت گذرتا رہا اور یہ شوخی اپنا رنگ پہلے وکھانے پھر جمانے لگی اور آج ہمارے آس پاس کوئی زبان اپنے

اصل رنگ روپ میں باقی نہ رہی۔ اوران زبانوں کے بولنے والوں کواس المیہ کا پتہ اس وقت چلا جب بہت دیر ہو چکی تھی لیکن اگر تھوڑی بہت کوشش کی گئی تو کسی حد تک کامیابی بھی ملی اور وہ ان قلمکاروں کو ملی جو دور دراز کے دیہات میں رہتے تھے یا وہاں سے شہر کی طرف آئے تھے۔اس کے علاوہ جن کو کم محنت سے زیادہ کامیابی ملی وہ لکھاری خواتین تھیں۔ کیونکہ ان کے پاس زبان بڑی حد تک محفوظ رہی۔آج اگر ہم ہندکو زبان کے ادب کا جائزہ لیں تو ہمارے پاس لکھنے والی خواتین کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔اس واسطے ہندکو زبان کا اصل روزمرہ۔ چٹخارہ بہت کم رہ گیا ہے۔ پھر بھی کچھ خواتین کا دم غنیمت ہے کہ انہوں نے اپنی ماں بولی کا مان رکھا ہوا ہے اور اسے محفوظ رکھنے کا بار اٹھایا ہوا ہے۔ان میں سب سے معتبر اور بڑا نام ثریا بانو کا ہے۔ایک تو انھیں اس مٹھی تے مٹھی زبان کی پہلی شاعر خاتون ہونے کا اعزاز حاصل ہے جن کا شعری مجموعہ ''تصویراں'' ۱۹۹۴ میں شائع ہوا۔اور یہ ہندکو زبان کی شعری تاریخ میں کسی بھی خاتون کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ پھر یہ اعزاز بھی اللہ نے ان ہی کو بخشا کہ وہ ہندکو زبان میں خواتین افسانوں نگاروں میں بھی پہلی افسانہ نگار ہیں جن کے افسانوں کا مجموعہ ''دل دے دکھ ہزار'' شائع ہوا۔ مگر یہ دو اہم کتابیں دینے کے بعد وہ گھر گرہستی کی ذمہ داریوں کی وجہ سے ایک عرصہ تک پوری توجہ کارِ ادب کو نہ دے سکیں۔مگر ''چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی'' گویا کارِ ادب سے بندہ (پابندی) لاتعلق کب رہ سکتا ہے۔اور ثریا بانو کو تو ادبی گل کتھ کے واسطے گھر میں زندگی کا وہ ساتھی میسر ہے جس کا اوڑھنا بچھونا ہی ادب ہے اور اس کو ہندکو اردو کی دنیا حسام حر کے نام سے جانتی ہے۔اور جس نے اپنی شریکِ سفرِ زندگی کے ادب کے ساتھ والہانہ پیار سے یہ فائدہ

اٹھایا ہے کہ پشاور کے ماضی کے بڑے ادبی زعماء (جن میں فارغ بخاری اور خاطر غزنوی بھی شامل ہیں) کی طرح اپنے گھر میں ہفتہ وار ادبی نشست کا آغاز کیا ہوا ہے۔ ماضی میں معاشی اور معاشرتی مسائل کی صورت حال آج سے بہت ہی مختلف تھی، اس واسطے گزشتہ کل یہ کام نسبتاً آسان تھا مگر آج کے مصروف اور 'پرائیویسی پسند' زمانے میں یہ ہاتھی پالنا ازدواجی زندگی کے سارے بوہے باریاں تہس نہس کرنے کے مترادف ہے۔ مگر دوستوں خصوصاً ادبی دوستوں پر صدقے قربان ہونے والے اس جوڑے نے اپنے گھر اور دل کے دروازے ہر ہفتے پیر کی شام کھلے رکھے ہوتے ہیں۔ تا کہ ''ملاقات'' کے دوستوں کو گھنٹی یا دستک دینے کی زحمت تک نہ اٹھانی پڑے ۔اس اکٹھ کا بھی ایک فائدہ ثریا بانو کو یہ ہوا کہ وہ کسی نہ کسی طرح ادب اور کارادب کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں۔ اس دوران انہوں نے پی ٹی وی کے لئے ہندکو گیتوں کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے۔ اب ہندکو کے ادب سے محبت کرنے والوں کے لئے ایک اچھی خبر یہ ہے کہ ثریا بانو کا دوسرا شعری مجموعہ ''تعبیراں'' ترتیب پا کر اشاعت کے لئے تیار ہے اور یقیناً آپ میری یہ چند سطریں ان کے شعری مجموعہ میں پڑھ رہے ہوں گے۔ جن کی نظموں، غزلوں گیتوں میں آپ کو ہندکو کی اصل زبان، محاورہ، خوشبو، چٹخارہ اور مٹھاس اس بات کا احساس دلائے گی کہ اس سونڑی زبان میں اپنے دل کی بات دوسروں تک پہنچانے کی اور آنے والے زمانے واسطے اپنے دور کی فکری تصویر محفوظ کرنے کی کتنی گنجائش ہے اور ''اس زبان کے اپنے بچوں نے ہندکو کو یکسر نظر انداز کر کے اپنی ماں بولی کو کتنا بڑا نقصان پہنچایا ہے'' اگر ثریا بانو کا یہ مجموعہ کسی دل میں یہ احساس جگا دے تو اپنی ماں بولی کی اس سے بڑی خدمت اور کیا ہوگی۔ میری بہت

شاباش اور بہت ساری دعائیں۔
نومبر 2014 کی آٹھویں صبح

تعبیراں
شاعرہ: ثریا بانو حسام

کرنوں کی تابانی

پشتون جس قدر بھی مہمان نواز ہوں تو ان کی محبت اور دوستی گھر کی دہلیز سے باہر ہوتی ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ ''چہ پردی سڑی نہ خودکور دچھت دلاڑ وھم ستر وی'' (نامحرم آدمی سے تو گھر کی چھت کی کڑیاں بھی پردہ کرتی ہے)۔ جو خواتین ایسی تہذیب اور ماحول میں زندگی بسر کرتی ہے، اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو کر اور ساری دنیا گھوم کر بھی جہاں بھی سکونت اختیار کر لیتی ہیں لیکن شرم وحیا، چھوٹے بڑے کا لحاظ، باپ کی پگڑی کی لاج اور ماں کے دوپٹے کی ناموس پر خود کو قربان کرنے کا جذبہ ان کی سرشت میں شامل ہوتا ہے۔ باوقار، باحیا اور محبت کرنے والی دوشیزائیں ان روایات سے روگردانی نہیں کر سکتی۔ شاعری یقیناً اللہ کی طرف سے ایک انعام ہے۔ پشتو زبان میں متعدد خواتین نے شاعری کی ہوگی لیکن اس میں ایسا مواد نظر سے نہیں گزرا ہوگا جس کا بزرگ برا مانتے ہیں۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ پشتو شاعری کے سرمایے میں ایسی معتبر اور روشن مثالیں موجود ہیں۔ اب اس میں ''درنڑا پلوشے'' (روشنی کی کرنیں) بھی شامل ہوگئی ہے۔ محترمہ ''رنڑا'' (روشنی) کی تربیت بھی اس ماحول میں ہوئی ہے، جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس لیے انہوں نے اپنے پہلے شعری مجموعے کو ''رنڑا'' (روشنی) کے نام پر شائع کرنا بہتر سمجھا۔ وقت کے کچھ اپنے فیصلے بھی ہوتے ہیں۔ جو بہت جلد سامنے آ

جاتے ہیں۔ جیسے انگریزی کے مشہور ناول نگار ''ودرنگ ہائٹس'' کی تخلیق کارہ۔ ''ایملی برونٹے'' اور ''جین آئر'' کی تخلیق کار ''شارلٹ برونٹے'' نے ابتدا میں اپنے ناولوں کو مردوں کے فرضی نام سے شائع کیا، لیکن خیر ہمارے شعروادب میں تخلص یا فرضی نام کی گنجائش موجود ہے اور ''رنڑا'' بھی ایسا چمکتا ستارا ہے کہ پڑھنے والے ان کی شاعری سے حظ اٹھائیں گے اور محبت کریں گے۔ اس لیے کہ ''رنڑا'' کی شاعری میں محبت کا اظہار ہجر ووصال کی کیفیتیں، محبوب کے انتظار کی سچی تصویریں سماجی بندھنوں کے پہلو بہ پہلو موجود نظر آتی ہیں۔

''رنڑا'' کی نظم اور غزل کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ شعر نہیں لکھتیں بلکہ روشنی پھیلاتی ہیں۔ خاص کر ''رنڑا'' کا شیریں لہجہ اور دل موہ لینے والا انداز بالکل ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ایک ناز پروردہ بچہ گھر والوں کو سکول یا دوستوں کی کہانی سناتا ہے۔ یہی لاڈ، ناز اور سادگی ''رنڑا'' کی شاعری کے منظر نامے کو فطرت کے ہر رنگ سے آراستہ کرتی ہے۔ جو پڑھنے والوں کو ایک پرسکون جزیرے کا احساس دلاتی ہے۔ ''رنڑا'' کے تیور ایسے ہیں کہ وہ اپنے خدا کے سامنے بھی بڑے ناز اور معصومیت سے یہ دعائیں مانگتی ہیں۔

''دعا دومرہ پہ شدت سرہ کوم لکہ پہ زور غواڑم''

(میں دعا مانگنے میں بھی اپنی من مانی کرتی ہوں)

امید ہے ''درنڑا پلوشے''

(روشنی کی کرنیں) پڑھنے والوں کی محفل کی رونق اور تنہائی کا مشغلہ بنے گی۔

''ماتہ جذبے ئی پہ تو دہ مینہ تو دی کڑلے،

(میں نے اپنے لہو کی گرمی سے اس کے جذبات کی سرد مہری کو گرما دیا ہے)

اوس بہ خامخاراتہ پہ چپلو شونڈ وزڑہ وائی''

(اب وہ ضرور مجھے اپنے نازک ہونٹوں سے دلدار کہے گی)

''پہ پیخو راوھشنغر باندے راتیر شہ اشنا،

(پشاور اور ہشتنگر کے راستوں سے گزرتا ہوا آجا)

''ڈالے دمینے تہ لمانہ پہ مردان واخلہ''

(محبت کے نذرانے تو مجھ سے مردان میں آ کر لے لے)

''سیند چہ سمندر تہ ورگڈ یگی مضطرب شی''

(دریا سمندر میں داخل ہوتے ہی مضطرب ہو جاتا ہے)

''لگ رانزدے شہ بیا رنڑا ٹولہ دزان واخلہ''

(ذرا قریب آ پھر رنڑا (روشنی) تجھ پر ساری کی ساری نچھاور ہو جائے گی)

''رنڑا'' کے دلنشیں اشعار، کومل جذبے، پشتونیت کی نکھری روایات اور محبت کے احساسات سے معمور خوبصورت نظموں اور آپ کے مابین مزید دیوار بننا نہیں چاہتا۔۔۔۔بسم اللہ۔۔۔

سال **2016**، ماہِ مئی کی آخری شب

(پشتو دیباچہ سے ترجمہ: سید شکیل احمد نایاب)

دا رنڑا پلو شے

شاعرہ: رنڑا نیویارک

ہر اک مضمون میں رنگ ہے جدا میرا

ستر(70) کی دھائی میں ہندکو آرٹس کونسل کی کوششوں کی وجہ سے نوجوان لکھنے والوں کا پورا ایک گروپ سامنے آیا جن میں باصر نسیم، حسام حر، فیاض اشعر، نسیم سحر، علاؤ الدین عالی، بشیر عامر اور کئی نوجوان لکھاری اپنے سے ذرا ہی سینئر ساتھیوں صابر حسین امداد، ش۔شوکت اور زیڈ آئی اظہر کی انگلی پکڑ کے زبان وادب کے سفر پہ روانہ ہوئے تھے۔ بعد میں ہندکو آرٹس کونسل تو پھر ''نصیب دوستاں'' ہوگئی لیکن یہ بات تاریخ کا حصہ ہے کہ کونسل نے ایک بھرپور کردار ادا کیا اور آج بھی اس کے آنگن میں آنکھیں کھولنے والے شعروادب کی دُنیا میں معتبر اور مستند لکھاریوں کی شکل میں موجود ہیں اور اپنے قرب وجوار کے لوگوں کو اپنے فن اور شعور سے فیضیاب وسیراب کررہے ہیں۔ ان میں بہت سارے تو ایسے ہیں کہ مسلسل کتابوں کی صورت میں ہندکو زبان کا دامن بھر رہے ہیں۔اور ایسے جیالوں میں ایک نوجوان شاعر نسیم سحر بھی ہیں جنہوں نے بہت عرصہ پہلے ایک کتاب مرتب کی مگر اپنی نہیں ہندکو زبان کے ایک طرحدار شاعر جلیل احمد کمالؔ کا شعری مجموعہ ''کل تے اج'' انہوں نے شائع کیا اور پھر اس کے بعد شاعر نسیم سحرؔ ادبی دنیا سے دور ہوگئے اور انجینئر نسیم سحر ملازمت کے ہوگئے شاید انہوں نے فیضؔ کا یہ شعر سن کے اپنی ترجیحات کو ہی بدل دیا کہ:

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دل فریب ہیں غم روزگار کے

مگر شعروشاعری کا چسکا ایسا ہے کہ آپ وقتی طور پر تو اِس سے پیچھا چھڑا سکتے ہیں لیکن مستقل نہیں۔ کبھی نہ کبھی باسی کڑی میں بھی اُبال آ ہی جاتا ہے اور انسان اپنے چھوڑے ہوئے راستوں پر دوبارہ سفر کا آغاز کرتا ہے اور یہی حال نسیم سحر کا بھی ہوا کہ صبح کا بھولا ہوا شام سے ذرا پہلے واپس لوٹ آئے اور ایک بار پھر ہندکو کی دلہن کے ہار سنگھار میں اپنا حصہ ڈالنے لگے۔ محفلوں میں آنے جانے لگے۔ حرفیاں اور غزلیں، نظمیں اور پرانے ذائقے تو سارے ہی چکھے تھے کچھ نئی باتیں محفلوں سے حاصل کر کے اب اپنے شعری مجموعہ کی جانب متوجہ ہو گئے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ شعروادب کی دُنیا میں واپس آتے ہی پہلے استاد عبدالرشید تاؔج کا بکھرا ہوا کلام اکٹھا کر کے ''پھل پروتے'' کے نام سے کمپوز کروایا تاکہ کتابی صورت میں محفوظ ہو جائے جو بعد میں گندھارا ہندکو اکیڈمی کے تحت چھپ کر منصۂ شہود پر آیا۔ یہ اس کی اپنی ماں بولی سے محبت کا ثبوت بھی ہے اور شعروادب کے ساتھ دلچسپی کا اظہار بھی اور پھر اساتذہ کا قرض بڑی حد تک چکا کر اپنا کلام اکٹھا کرنا شروع کیا۔ اس کے اپنے شعری مجموعے میں ہندکو کی قدیم اصناف بھی موجود ہیں اور جدید رنگ کے نمونے بھی یعنی حرفی اور زنجیری کے ساتھ ساتھ حمد و نعت، غزل اور گیت کا بھی عمدہ اور خوبصورت رنگ نظر آتا ہے۔ سادگی اور سلاست نسیم سحؔر کے کلام میں ایک خوبصورتی پیدا کرتی ہے۔

کسراں دلو میں اسنوں پُھلا دیواں
جیہڑا رگ رگ اچ میری سمائیا وے

آج کی ہندکو میں ''پُہلا دیواں'' تو زیادہ استعمال ہوتا ہے لیکن ''وسار دیواں'' جیسا زبان کا ذائقہ اس میں نہیں۔ نسیم سحرؔ نے ایک زنجیری میں جو شاعرانہ تعلّی کی ہے وہ کچھ ایسی غلط بھی نہیں ہے کہ:

آ پڑے سینے دیوچ اجلا بل رکھناں
ہر اندازاچ بولنڑ یں دا چل رکھناں
گہل گہل دے بدل دی گہل رکھناں
ہر مضمون اچ رنگ اے جدا میرا

اِسی طرح اگر غزل کا شعر ہو:

اجل ٹھہر جا زندگی اگر ہیوے تا
منوں آ پڑی قسمت تے رولینڑ یں دے

یا پھر حرفی کا مصرع:

گئے بدل زمانے دے رنگ سارے
تو بی بدل دے کجھ تا نظام آ پڑے

ہر مضمون میں نسیم سحرؔ نے اپنے جداگانہ رنگ کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شعر و ادب کی دنیا سے دوری نے نسیم سحرؔ کو خوب تنگ کیا ہوگا کہ اس کو اپنے شعری مجموعہ کی اشاعت میں دیر ہوگئی ہے۔ اپنے کلام کے جگر لخت لخت کو جمع کرتے ہوئے اس کو یہ احساس بھی ہوا ہوگا کہ گذشتہ ''کل تے اج'' کے درمیان پُل کے نیچے سے بہت پانی گزر گیا ہے لیکن مجھے امید ہے کہ اپنی ہی کتاب کی اشاعت ان کو تحریک دے گی کہ وہ اپنی ماں بولی کے دامن میں اپنے تازہ افکار کا تحفہ بھی ایک اور کتاب کی

شکل میں پیش کریں گے۔ سرِ دست میں نسیم سحر کے شعری مجموعہ کو کھلے دل سے خوش آمدید کہتا ہوں۔

پھل پروتے

شاعر: نسیم سحر

(ہندکو دیباچہ سے ترجمہ۔ اویس خیال)

ارشد جان کی غزل شاہکار ہے

ان دنوں سوشل میڈیا کی اس بھیڑ میں سے اچھی آوازیں بہت کم سنائی دیتی ہیں۔ سچی بات ہے کہ یار لوگوں نے تو مذاق بنا رکھا ہے۔ ایسی ایسی چیزیں دیکھنے اور سننے کو ملتی ہیں کہ من کرتا ہے کہ موبائل فون ہی زمین پر دے ماروں۔ خاص طور سے شعر کے نام پر وہ پڑھنے کو ملتا ہے جو ذوق اور دل کو چند ہی سیکنڈ میں ریزہ ریزہ کر دیتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس یہ بھی اسی سوشل میڈیا کی برکت ہے کہ بہت اچھی شاعری، بہت اچھے کومنٹس اور ویڈیوز کے ساتھ ساتھ بہت اچھی موسیقی کے ساتھ بھی شناسائی پیدا ہوتی ہے۔ میں نئی نسل کے کئی ایک عمدہ اردو پشتو شعرا کے کلام فیس بک اور واٹس ایپ کے ادبی صفحات میں دیکھتا ہوں اور کبھی کبھی کمنٹس بھی کرتا ہوں۔ ان نوجوانوں میں سے ایک اہم نام ارشد جان شاہکار کا بھی ہے، جب بھی میں نے ان کی کوئی غزل پڑھی، مزا آ گیا، میرا ان سے تعارف نہیں تھا مگر انہی دنوں ایک جمعہ کو اچانک لائیو ریڈیو پروگرام میں ارشد جان کی باتیں سنی تو فوراً میرے دل میں سما گئے۔ یہ بھی سچ ہے کہ ہم پٹھانوں کا سب سے مضبوط اور قابل فخر انسٹی ٹیوٹ 'مشر کشر'' (چھوٹے اور بڑے) کی تمیز کرنا ہے، لیکن نئی نسل کے کچھ دوست جب فیس بک پر تھوڑی بہت مقبولیت حاصل کر لیتے ہیں تو ان کی آنکھیں اور لب و لہجہ بدل جاتا ہے (یا شاید ایکسپوز ہو

جاتے ہیں) اور تب ان کی تضحیک کا پہلا نشانہ ان کے اپنے بڑے اور استاد ہوتے ہیں۔ شیخ سعدی فرماتے ہیں کہ "کم ذات چوں عاقل شود گردن زند استاد را" (کم ذات جب سیکھ جاتا ہے تو پہلے اپنے استاد کی گردن کاٹتا ہے)

پختون مشران (بڑے) مسلسل اپنے چھوٹوں کو یہی یاد دہانی کراتے ہیں کہ "جہاں بھی جاؤ اپنی اوقات نہ بھولو" جواں فکر ارشد جان شاہکار نے بہت جلد فیس بک پر اپنے دوستوں کا ایک بڑا حلقہ بنالیا اور مقبولیت کی چاشنی کو بھی بہت جلد پالیا اور جتنی دیر اس نوجوان کو اپنے چاہنے والوں دوستوں کی محبت اور توجہ ملتی رہی۔ شاہکار ایک باردار درخت کی طرح بڑے عجز کے ساتھ اپنی محبت انھیں پیش کرتے رہے۔ ایک مخلص ادیب اور اچھی تربیت پانے والے نوجوان کی یہی نشانیاں ہوتی ہیں۔ جب مجھے پتہ چلا کہ ارشد جان نے فیس بک اور ریڈیو تک اپنی ادبی سرگرمیاں محدود نہیں رکھیں بلکہ وہ بہت ساری ادبی تنظیموں اور ثقافتی تنظیموں میں بھی اپنا پرجوش کردار ادا کر رہے ہیں۔ وہ ایک ایسے فل ٹائم شاعر، ادیب اور تنظیم کار ہیں کہ لوگ ان کا کلام سننے کے ساتھ ساتھ ان کے مشورے اور باتیں بھی توجہ اور سنجیدگی سے سنتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ اس عمر میں اتنی بڑی کامیابی رب کریم کا انعام ہی ہے جو محض ان لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ جو محبت پر ایمان لائے ہوئے ہیں۔ اس محبت کرنے والے دوست کو میں نے اپنے ٹی وی کے ادبی پروگرام "ادبی ٹولنہ" میں اس غرض سے بلایا کہ ہشتنگر کے علاقے کی رفتار ادب سے آگاہی حاصل ہو سکے۔ پروگرام میں ان کے دوست اور ہمراہی فلمکار مشتاق شاہین بھی شریک ہوئے۔ یہ ایک بہت دلچسپ پروگرام تھا۔ وہیں معلوم ہوا اور بہت خوشی ہوئی کہ ارشد جان شاہکار اپنا شعری مجموعہ

ترتیب دے رہے ہیں۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ پڑھنے والے بھی اس کے شعر کے اعجاز سے لطف اٹھا سکیں اور اساتذہ بھی ارشد جان شاہکار کے کلام کا تنقیدی جائزہ لے سکیں۔ میں نے بھی ارشد جان کی شاعری کے ساتھ اپنے حصے کا رومانس کیا ہے۔ اس لیے میں یہ بات برملا کرسکتا ہوں کہ شاہکار کی شاعری اگر ایک طرف اپنے اردگرد کے ماحول میں سانس لے رہی ہے۔تو دوسری طرف شاہکار کی شاعری روایات سے بھی منہ نہیں موڑتی۔آج کی پشتو غزل کو بہت سارے چیلنجز کا سامنا ہے اور شاہکار کو بھی اس بات کا بخوبی اندازہ ہے لیکن پھر بھی یہ نوجوان شاعری کے تخلیقی، جمالیاتی چوکھٹے سے بہت کم باہر نکلتے ہیں اور یہ تخلیقی جمالیات ایک خالص غزل کی متقاضی ہے۔محبت کے چھوٹے چھوٹے گلے شکوے، کھٹے میٹھے فسانے، روٹھنا منانا، محبوب کی آنکھوں کے اشاروں کو دیکھنا، سمجھنا، محبوب کی مرضی پر چلنا اور اپنے عشق کو عجز و انکسار کی چادر میں لکانا چھپانا ہی ارشد جان کی غزل کو شاہکار درجے پر پہنچاتا ہے،

هره خبره کے به خپل زان ملامته کڑمه
اے مڑے! بس ستا د مرضے مافی به اوغواڑمه

(اپنی ایک ایک بات پر خود کو شرمسار کرلوں گا،۔
ارے! پھر جیسا تو چاہے گی، نا؟ میں تم سے ویسی ہی معافی مانگ لوں گا، بس)

ارشد جان کو قدرت نے لفظوں سے تصویریں بنانے کا ہنر بخشا ہے اور مجھے ان کے اشعار میں ایسی ایسی پینٹنگز اور تصویریں دکھائی دیتی ہیں کہ منہ سے بے ساختہ داد اور دل سے جواں فکر شاعر کے لئے بہت دعا نکلتی ہے کہ اچھی صحت کے ساتھ ترقی کے زینے طے کرے۔ یہ تصویر ملاحظہ کریں۔

ستا تصویر چہ مے راوغستہ نو پوئے شوم
چہ پہ لاسو کے سپوگمی سوک سنگہ نیسی
(میں نے جب تیری تصویر اٹھائی تو سمجھ گیا
کہ کوئی ہاتھوں میں چاند کو کیسے اٹھاتا ہوگا)

اسی طرح دل کو موہ لینے والے اشعار ان کی ہر غزل میں سے سر اٹھاتے ہیں اور قاری کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور جس شاعر کی شاعری اپنی وکالت خود کرے تو ایسا شاعر اپنے پڑھنے والوں کی محبت سے کب تک دور رہ سکتا ہے اور پھر ارشد جان شاہکار کے لہجے میں جو بے تکلفی ہے اور پشتو کا روزمرہ اور مکالماتی انداز ہے یہ ہنر بھی بہت کم شاعروں کو ودیعت ہوتا ہے۔

''اے مڑے بس'' (چھوڑو بھی یار)۔۔

''اے دزڑہ سرہ'' (او جانِ من)

''ستا سہ خیال وو چہ ماتہ بہ'' (تو کیا سمجھتی تھی کہ مجھے تُو)

''منے کہ نہ چہ ماوے'' (مانتی ہونا، میں نے کہا نہیں تھا)

اور یہ ایک غزل تو ردیف ہے ''نو سہ دے خیال دے'' (کیوں کیسی رہی۔) میری مانو تو (کیوں کیسی رہی) کی تصویر پلکوں میں بسا کر چپکے سے ارشد خان کے شہکار ارژنگ (نگار خانے) میں بہت احتیاط کے ساتھ داخل ہو جاؤ، احتیاط اس لئے بھی لازمی ہے کیونکہ یہاں موجود ہر تصویر آپ کے ہونٹوں پر مہر خموشی ثبت کر کے آپ کو خود سے باتیں کرنے والا بنا دے گی، آپ جانتے ہیں نا کہ خود سے باتیں کرنے والے کو دنیا والے کیا کہتے ہیں، آپ سے کیا پردہ اس تصویر کو دیکھ کر میں خود بھی ابھی تک دم

بخود ہوں۔۔دیکھئے نا۔کیا منظر ہے۔۔۔۔

نن رانہ زکہ رقیبانو ستر گے نہ ویستلے
بیگاہ ور غلے دجانان مے پہ زنگون ستر گے وے

رہے رقیب نہ پھر مجھ سے ایک پل غافل
جو میرے زانو پہ شب، یار کی تھی، آنکھ لگی

لاترا اوسہ درتہ یادئم
ارشد جان شاہکار
(پشتو دیباچہ سے ترجمہ: پروفیسر راشد حسین)

دوسروں کو خود سے تو بہتر سمجھ

کبھی کبھی اس محرومی کا احساس بہت تنگ کرنے لگتا ہے کہ ہندکو زبان میں لکھنے پڑھنے کا سلسلہ اتنی دیر کے بعد کیوں شروع ہوا، اتنی قدیمی اور میٹھی زبان کے ادب کا کتنا بے بہا ذخیرہ وقت کی گرد تلے دب کے رہ گیا۔ زبانی کلامی شعر و شاعری کا رواج مشاعرے اور محفلوں کی رونق تو بنا رہا اور اپنے زمانے کے لوگوں کے لئے ایک تفریح اور علم کا باعث بھی بنتا رہا مگر آنے والے وقت کی نہ کسی نے پروا کی اور نہ ہی اس کے لئے وراثت میں کچھ چھوڑا۔ ایک، دو، چار پیڑیوں تلک تو یہ کلام اپنے وزڈم کے بل پر تو سینہ بہ سینہ ضرور سفر کرتا رہا لیکن پھر نئی روشنی اور نئے ستاروں کی چکا چوند میں کہیں کھو گیا، آج کا دور اِس لحاظ سے غنیمت ہے کہ ہندکو زبان میں کتابوں کی اشاعت کا ایک معتبر سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ آج کے دور کے بعض محبت اور خلوص میں شرابور احباب ہوں یا پھر ادارے جن سے جتنا بھی ممکن ہو سکے یا ہو سکتا ہے اِس زبان کے ادب کو محفوظ کرنے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ آج کے اِس مصروف اور ذرا مختلف زمانے میں جو بھی ساتھی اِس کام کے لئے میدانِ عمل میں موجود ہیں اُن میں نئی نسل کے جیالوں کی تعداد زیادہ ہے نسیم سحر بھی ایک ایسے ہندکو زبان و ادب کے ساتھ تعلق رکھنے والے جوان فکر دوست ہیں جنہوں نے ہندکو آرٹس

کونسل کے پلیٹ فارم سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا تھا مگر بجائے اپنی کتاب شائع کرنے کے اُن کا جو پہلا کام سامنے آیا ہے وہ جلیل احمد کمال جیسے بے بدل ہندکو شاعر کا مجموعۂ کلام ''کل تے اَج'' تھا۔ اِس شعری مجموعہ کی ترتیب وتدوین واشاعت نے نہ صرف غلام رسول گھائلؔ اور اُستاد آغا محمد جوشؔ کے دیوان کے بعد پشاور سے پہلے با قاعدہ مجموعہ کے طور پر پذیرائی حاصل کی ہے بلکہ نسیم سحر کی ادب دوستی کی بھرپور پہچان بھی کروائی ہے۔ مگر اِس کے بعد اِس جوان کا کوئی پتہ نہ چلا۔ اب ایک لمبی غیر حاضری کے بعد وہ دوبارہ ادبی دُنیا کی طرف آئے ہیں تو ان کے چہرے پر صاف لِکھا ہوا نظر آیا کہ ہندکو زبان وادب کا نشہ ابھی خمار میں نہیں بدلا۔ یعنی!

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

ہندکو زبان وادب کا یہ بے لوث محبتی ایک بار پھر اپنے مجموعہ کلام کو مؤخر کر کے ہندکو زبان وادب کے صحیح معنوں میں یہ مجاہد، اُستاد عبدالرشید تاجؔ کے مجموعہ کی اشاعت کا بندوبست کر رہا ہے۔ نسیم سحر نے ماضی میں اُس وقت اپنا گھر اور توانائیاں ہندکو زبان کے لئے وقف کی تھیں جب ہندکو سے وابستگی اور ہندکو بولنے والے اردو کے ادیب شاعر شرمندگی محسوس کرتے تھے۔ نسیم سحر کا یہ کارِ خیر بھی یقیناً ہندکو زبان وادب کے ساتھ دلچسپی رکھنے والے احباب سے زبردست شاباشی حاصل کرے گا کیونکہ اُستاد ساجنؔ اور اُستاد عبدالرشید تاج کی حرفیوں کی بازگشت فی الوقت اِس شہر کی فضاؤں میں موجود ہے اور کئی ایک ہندکو حرفی کے محبتی اُن کے کلام محفلوں میں پڑھ کے محفل کے لطف کو دوبالا کرتے ہیں۔ میں نے بھی پشاور آنے کے بعد اباسین آرٹس کونسل، ہندکو

آرٹس کونسل اور دیگر تنظیموں کے مشاعروں میں انھیں اپنے مخصوص انداز میں شعر پڑھتے اور مشاعرہ لوٹتے دیکھا ہے۔ ہندکو زبان کے اساتذہ کی حرفیوں میں موجود اُن کا اپنا زمانہ، اپنی ثقافت اور تمدن تو صاف نظر آتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ اپنے دور کی خامیوں اور کوتاہیوں پر بھی ان کی بڑی گہری نظر تھی اور اُن بُری عادات اور رسوم کا محاسبہ بھی بڑے عالمانہ انداز میں قرآن و حدیث کی روشنی میں کیا کرتے تھے۔ ان اساتذہ کی ایک بڑی تعداد اگرچہ رسمی تعلیم سے دور تھی مگر یہ بات ان کے کلام میں کبھی نظر نہیں آئی کیونکہ فارسی، عربی، اُردو اور علاقائی زبانوں کی ساری حکمت ان کی حرفیوں میں موجود ہے اور اتنی روانی اور سہولت سے وہ ان کا استعمال کرتے رہے ہیں کہ رشک آتا ہے۔ اُستاد عبدالرشید تاؔج کی حرفی بھی اِسی طرح کی بے پناہ حکمتوں اور دانائیوں سے بھری پڑی ہے۔ شہرِ ہفت زبان پشاور کے باسی ہمیشہ سے ان زبانوں پر مکمل عبور رکھتے تھے پھر شعر و شاعری میں انہیں برتنے کا سلیقہ بھی ان کے پاس تھا جس کی وجہ سے اساتذہ کے کلام میں ایک عالمانہ شان ہمیشہ پڑھنے والوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے۔ اصل میں وقت، حالات اور فطرت اِس طرح کے باکمال اور بے بدل لوگوں کی تربیت خود کرتی ہے اور ان میں ایک معتبر نام اور حوالہ اُستاد عبدالرشید تاج کا بھی ہے۔ زندگی گذارنے کے جو طور طریقے بڑے بڑے فلسفیوں کی مشکل مشکل بحثیں حل نہیں کر سکیں ان کو برتنے کا سلیقہ سادہ اور آسان لفظوں میں اُستاد تاؔج کے کلام میں موجود ہے اور آسان شعر کہنا کتنا مشکل کام ہے، اس کا اندازہ شعر و ادب کے جاننے والوں کو بخوبی ہے۔ یہ حرفی دیکھیں تو چار مصرعوں میں زندگی گذارنے کا کتنا آسان اور خوبصورت گُر سکھلا گئے ہیں۔

سونڑیں داوصل گر یار چانے! پہلے دووے دے کولو مُنہ موڑ پیارے
بہتر آ پڑے سی سمجھ دوسرے نوں، نال عاجزی دے رشتہ جوڑ پیارے
دو جہاناں وِچ گر سُرخرو سنیں!، لگی توڑ دی ہرگز نہ توڑ پیارے
کیندا تاج گر چاہنیے مُراد دل دی؛ حضرت عشق دا دامن نہ چھوڑ پیارے

صرف اِتنی بات کہ ''بہتر آ پڑے سی سمجھ دوسرے نوں، نال عاجزی دے رشتہ جوڑ پیارے'' کیا ہماری آج کی ساری الجھنیں ان بے چینیوں اور بے سکونیوں کی وجہ نہیں، اِس طرح کے بے شمار مصرعے آپ کو اس باکمال اور بے بدل شاعر کی حرفی میں نظر آئیں گے اور ہر مصرعہ ہم سے یہی تقاضا کرتا ہے کہ ''میرے دوست! تھوڑا جیا وخت میرے نال گذار'' تمہیں تمہارے بہت سے مسائل کا حل مل جائیگا۔ اخلاقیات کے سارے سبق ایک طرف اور اُستاد کا یہ ایک مصرعہ ایک طرف!

قدم آہستہ رکھ اس زمین اُتے؛ تیرے سِر اُتے ریسی آسمان ہو کے فن اور زبان دونوں کا مزہ اور چٹخارہ؛ زمین اور آسمان کا حوالہ؛ قرآنی حکمت کا پرتو؛ دنیا کی بے ثباتی؛ آخری گھر کی غیر محسوس نشاندہی اور زندگی گذارنے کا گُر اِس ایک مصرعے میں کیا کچھ نہیں یا پھر یہ۔۔۔۔مصرعہ! ''جیڑے ساز وِچ سوز جس تار دا سی؛ اُسی ساز نوں کر کے بیکار ٹُٹ گئی''

حکمت اور دانائی کا یہ علامتی اظہار کسی اُمی شاعر کا ہو سکتا ہے بس اِس طرح کا کلام سن کے اور پڑھ کے اُس محرومی کا احساس میری سانس کو چھوٹا کر دیتا ہے کہ بے توجہی سے علم و ادب کا کتنا بڑا خزانہ آنے والے ادوار کے لئے محفوظ نہ رکھ کے ہندکو بولنے والوں نے اپنے اور اپنی ماں بولی کے ساتھ کتنی بڑی ناانصافی کی ہے، لیکن جب میں دیکھتا

یوں کہ میرے آس پاس چند دوستوں اور اداروں نے آج کے اِس مصروف ، ادب بیزار اور ایک کٹھور دور میں ہندکو زبان و ادب کو محفوظ کرنے کا جو ایک مشکل کام سنبھالا ہوا ہے۔تو میری ڈھارس بندھ جاتی ہے کہ میں بھی اسی دور میں سانس لے رہا ہوں

(گل بہار پشور 8 نومبر 2006)

دل کنارے

مصنف: نسیم سحر

گزشتہ شب کے دیکھے ہوئے خواب

رسول حمزہ توف کہتے ہیں کہ صبح سویرے آنکھ کھلتے ہی بستر سے اٹھ کر اس طرح مت بھاگو جیسے کسی چیز نے تمہیں ڈنک مار دیا ہو بلکہ کچھ دیر بیٹھ کر اس خواب کے بارے میں سوچو جو تم نے رات کو دیکھا ہے میں اپنی سہولت کے لئے اس قول کے ساتھ وہ مشورہ بھی جوڑ دیتا ہوں جو انہوں نے نوجوان ادیب کو دیتے ہوئے کہا ہے کہ ’’ لکھنے کے لئے کبھی موضوع نہیں، آنکھیں مانگو‘‘ لیجئے اب منظر زیادہ کھل رہا ہے، میرے نزدیک شعر کا واردات بننا اور کہانی کا حرز جان بننا دونوں آگہی کے ایسے عذاب ہیں جو بیک وقت جان لیوا بھی ہوتے ہیں اور تخلیق کا عمل مکمل ہونے کے بعد ایک سکھ بھری زندگی میں ٹرانسپورٹ بھی کر دیتے ہیں تخلیقی لمحوں کی ساری اذیتیں تسلیم مگر یہ بھی سچ ہے کہ جب لکھنے والے سے تخلیق عارضی طور پر بھی روٹھ جاتی ہے اور وہ خالی خالی سا رہ جاتا ہے تو بھی کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے، یض احمد فیض نے کہیں کہا ہے کہ جب شعر نہیں ہو رہے ہوتے ہیں تو میں تراجم شروع کر دیتا ہوں‘ ٹھیک ہی کہا ہے جب غیب سے مضامین کی آمد رک جائے تو نیٹ پریکٹس کے لئے یہ شغل بھی بہت اچھا ہے، حسرت موہانی کا شعر ہے کہ

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

سندھ کے معروف شاعر شیخ ایاز نے اپنی کتاب ''میری شاعری میری صلیب'' میں اس پر خوب تبصرہ کیا ہے کہ

''حسرت موہانی جیل میں چکی پیستے تھے اور اس کے سادہ ورنگین

پیراہن کو بھی یاد کرتے تھے۔۔

چکی کی مشقت کو آسان بنانے کا یہ اچھا طریقہ ہے۔''

کل وقتی کام میں کسی سبب سے کھنڈت پڑنا جز وقتی مشاغل کی راہ ہموار کرنا تو سمجھ میں آتا ہے مگر شاعری جیسے اذیت ناک تخلیقی عمل کے ساتھ ساتھ کہانی بننے کا روگ پالنا ایک ادق مشق ہے، لیکن اگر کسی کی گھٹی میں مہم جوئی لکھی ہوئی ہو تو اور بات ہے، مہم جو بھی ایسا جیسا ڈاکٹر عامر بیگ ہے جو کوئی بات ایک بار ٹھان لے تو کشتیاں جلا کے آگے بڑھتا ہے، نیویارک کی ایک ادبی محفل میں اس کی پہلی پہلی شرکت تھی، دو ایک قریبی دوستوں کے علاوہ شاید انہیں کوئی نہیں جانتا تھا،، یہ گفتگو کی محفل تھی جہاں ان کی بے ساختہ گفتگو نے سب کو ان کی طرف متوجہ کر لیا تھا، میری صدارت تھی سو دو چار ادھر ادھر کی باتیں میں نے بھی کیں، نشست ختم ہوئی تو چائے کی میز پر عامر بیگ میرے پاس آئے، تعارف کرایا اور پوچھا کب تک نیویارک میں ہیں میں نے کہ آج شام تو دوستِ مہرباں معروف کالم نگار اور دانشور عتیق صدیقی کے ساتھ بنگ ہیمٹن جا رہا ہوں دو دن بعد واپسی ہوگی، یہ سن کر کھل اٹھے یہ تو اچھی بات ہے میں ان کے قریب ہی 'سریکیوز' میں رہتا ہوں، آپ کی اجازت ہو تو میں کل کسی وقت آ جاؤں گا، رات میرے مہمان ہوں گے پھر دوسری صبح اکٹھے نیویارک آ جائیں گے۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ میں اور عتیق صدیقی دونوں پشاور سے ہیں اور پشتو روزمرہ کے مطابق

''مہمان اپنے میزبان کے کھونٹے سے بندھا ہوا بیل ہوتا ہے جو بھلے سے کتنا بھی طاقتور ہو میزبان کی مرضی کے بغیر ہل بھی نہیں سکتا، ں اب لطیفہ یہ بھی ہوا کہ عتیق صدیقی بھی انہیں نہیں جانتے تھے وہ تو ویسے بھی اپنا مہمان کسی کو نہیں سونپتے چہ جائیکہ ایک اجنبی کو حوالے کر دیں، لیکن عامر بیگ نے انہیں اس حد تک قائل کر لیا کہ چلیئے کھانا اکٹھا کھالیں گے پھر جس طرح آپ کہیں گے، وہ ایک طوفانی برفانی رات تھی جب کئی فٹ برف میں دھنسے ہوئے ڈاکٹر عامر بیگ کے خوبصورت فارم ہاؤس ہم پہنچ گئے، پاؤلو کوئیلو نے اپنے ناول الکیمسٹ میں لکھا ہے کہ جب ایک بار آپ کسی کام کا تہیہ کر لیتے ہیں تو کائنات کی ہر چیز آپ کی مدد کنے پر آمادہ ہو جاتی ہے، اس یخ بستہ رات ڈاکٹر عامر بیگ کے کوزی کوزی فارم ہاؤس میں ڈاکٹر عامر کی مدد کو اس وقت آشا بھونسلے آ گئیں جب میں نے فرمائش کی کہ بڑی سکرین پر شکیل بدایونی کا فلم ''صاحب ،بی بی اور غلام،'' کے لئے لکھا ہوا ایک کورس گیت ''ساقیا! آج مجھے نیند نہیں آئے گی ،سنا ہے تیری محفل میں رت جگا ہے۔۔آنکھوں آنکھوں میں یوں ہی رات گزر جائے گی، سنا ہے تیری محفل میں رت جگا ہے''ہیمنت کمار کی جادوئی موسیقی نے ہم تینوں کو کھلنڈرا بنا دیا تھا، اجنبیت کی ساری دیواریں گر گئیں تھیں، جانے اس رات کتنی بار اس کورس کو سنتے ہوئے بہ آواز بلند گاتے بھی رہے، رت جگا جاری تھی کہ عتیق صدیقی نے کہا کہ میں چلتا ہوں بہت دیر ہو گئی ہے، کل نیو یارک بھی جانا ہے آپ انجوائے کریں، گویا اب وہ اطمینان سے اپنا مہمان چھوڑے جا رہے تھے،ڈاکٹر عامر بیگ نے کہا میں ان کو لے جاؤں گا آپ پھر اپنی سہولت سے آ جایئے گا۔ میر تقی میر نے درست کہا ہے کہ ''عمر بھر ایک ملاقات چلی جاتی ہے'' ایسا ہی ہوا اب کئی برس بیت گئے

مگر وہ رت جگا اب تک چل رہا ہے حالانکہ وہ سریکیوز سے اب وہ نیو جرسی شفٹ ہو گئے ہیں صحت کے سائل کا بھی شکار رہے مگران کے اندر ایک شاعر انگرائی لے کر بیدار ہو چکا تھا پھر ادب اور کار ادب کو رگ جاں کے قریب رکھنے والے ڈاکٹر عامر بیگ نے بہت کم عرصہ میں شعر سے دوستی کرتے ہوئے اپنے چاہنے والوں کو"محبت استخارہ ہے" جیسا بہت ہی منفرد لہجے کا شعری مجموعہ دیا، میں نے کہا نا کہ ڈاکٹر عامر بیگ جس کام کا تہیہ کر لیں بس وہ ہو جاتا ہے، اس دوراں ایک دن مجھے ان کا فون آیا کہ آج میں نے نیو یارک کے حلقہ ارباب ذوق میں اپنا پہلا افسانہ تنقید کے لئے پیش کرنا ہے، میں نے کہا غزل پیش کر دیں، کہنے لگے وہ تو کئی ایک پیش کر چکا ہوں اب ذرا کہانی کو آزماتا ہوں میں سمجھ گیا اب اس نے پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا، لیکن غزل تو خیر چلتے پھرتے بھی ہو جاتی ہے مگر کہانی کے اپنے سو بکھیڑے ہوتے ہیں بے ہنروں کو تو افسانے کا گھوڑا اپنی پیٹھ پر تھپکی کرنے بھی نہیں دیتا، اپنے ایالوں میں انگلیاں پھیرنے نہیں دیتا، میں نے کہا مجھے ضرور بھیجنا انہوں نے افسانہ بھیجا میں نے پڑھنا شروع کیا تو جیسے کہانی قطرہ قطرہ میرے اندر اتر رہی ہے، سیدھے سادے لفظوں کی بنی ہوئی کہانی کے ساتھ میں بہے جا رہا تھا، مجھے رسول حمزہ توف یاد آ گئے موضوع نہیں آنکھیں مانگو۔ یہ کہانی نہیں تھی ایک واردات تھی جس کو آنکھیں دیکھ رہی تھیں قلم لکھ رہا تھا اور پڑھنے والا سوچ رہا تھا مجھے کس کا طرفدار ہونا ہے، کسی کورین کی خاطر اپنے خاوند کو چھوڑ کر کسی میکیسن سے شادی کرنے والی کلثوم کا، معصوم بچوں کا یا مومن ہوتے ہوئے بھی دوسری بار شادی کے سوراخ سے خود کو ڈسوانے والے برادر ابو صالح کا یا پھر کہانی کار کا جو بات ادھوری چھوڑ کر پڑھنے والے کو کسی اور کیفیت میں ٹرانسپورٹ کر دیتا ہے۔ پھر یکے بعد

دیگرے کہانیاں لکھی جاتی رہیں اور ایک دن پوری کتاب تیار ہوگئی، جس میں ایک افسانہ کا نام کتاب کو بھی دے دیا ''مانتو''، میں کہانیاں پڑھتا گیا ایک سے ایک کہانی ایک الگ ذائقہ کی حامل دھیرے دھیرے قریب آ کر اپنا آپ سونپنے والی کہانی سرگوشیاں کرتی ہوئی کہانی، دل کی دھڑکنوں پر ناچتی کہانی، بھیگی آنکھوں کے قصے سناتی کہانی، دل و دماغ کی بجائے جسم سے سوچتی ہوئی کہانی اور پھر ایک کہانی ''تم نے میرے عامر کو دیکھا'' میں چونک اٹھا، کہانی کا یہ عنوان مجھے بہت ہٹ کے لگا، یہ کہانی جب اس موڑ پر پہنچتی ہے کہ جب ''صائمہ اپنے دروازے پر کھڑے سارا دن آنے جانے والے کو پوچھتی تم نے عامر کو دیکھا ہے ایک شام جب بجلی کی پاور آٹ تھی مجھ سے ملتے جلتے لانڈرے نے دھیمی آواز میں کہہ دیا میں تمہارا عامر ہوں تو وہ دیکھے بنا اس سے لپٹ گئی اس نے بھی تاریکی کا خوب فائدہ اٹھایا اور صائمہ کی دنیا تاریک کر دی'' تو مانتو کے افسانے مجھ پر اپنا آپ کھولنے لگتے ہیں، یہ کہانیاں نہیں ہیں یہ افسانے نہیں ہیں، یہ تو کھلی آنکھوں سے دیکھے قصے ہیں، یہ تو بیتے زمانے کے وہ لمحے ہیں جو اس کی آنکھوں نے ہی نہیں اس کے جسم و جان نے بھی دیکھے ہیں، سہے ہیں، یہ تو مانتو میں خود کو چھپائے ہوئے وہ برہنہ سچ ہیں جو چیخ چیخ کر اپنی برہنگی کا آشکارا کرتے ہیں، یہ شعر میں غیب سے آنے والے مضامین ہیں نہ کھوجے گئے کوئی موضوعات ہیں، یہ تو زندگی کے بخشے ہوئے وہ تجربے ہیں جو ایک ایک کر کے گزشتہ شب کے پچھلے پہر کے دیکھے ہوئے خواب بن گئے ہیں، جنہیں وہ رسول حمزہ توف کے مشورہ سے دو قدم آگے جا کر ان کے بارے میں صرف سوچتے ہی نہیں انہیں بلا کم و کاست بیان کر کے اپنے عہد کو سونپ بھی رہے ہیں، مان لیجئے کہ ''مانتو'' کی صورت میں ڈاکٹر عامر بیگ نے' اپنے

عہد کی سفاک حیوانیت، برہنہ کمینگیوں اور شرمناک منافقتوں کے خلاف ایک ایف آئی آر درج کرادی ہے۔

مانتو

کہانی کار: ڈاکٹر عامر بیگ

لکھنا اپنے عہد کی گواہی

لکھنا اپنے عہد کی گواہی دینے کی طرح ہے، جو کہوں گا سچ کہوں گا سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا اس بیانیہ کو ایک وکیل سے بہتر کون جان سکتا ہے اور وکیل بھی ایسا جسے بولنے کے ساتھ ساتھ قدرت نے لکھنے کی صلاحیت بھی ودیعت کی ہو تو اس کی ذمہ داری دہری ہو جاتی ہے، محمد حسین وکالت کے پیشہ سے متعلق ہے اور ایک طرح دار کالمسٹ کے طور پر بھی اپنی ایک معتبر اور باوقار پہچان اور شہرت رکھتا ہے، اس وقار اور اعتبار کی وجہ اس کی وہ مسلسل ریاضت ہے جس سے ایک پل کبھی وہ غافل نہیں رہا۔ اس کی سپھلتا کی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ جو بھی دیکھتا ہے، اس پر بات کرنے سے پہلے اسے اپنی دانائی کی کٹھالی میں ڈال کر اور دلسوزی کی آگ پر خوب تپا کر کر مصلحت کی کثافتوں سے پاک کر دیتا ہے، اسی مشق سے اس کے قلم کو بے خوفی، بے باکی اور راست گوئی عطا ہوئی ہے، وہ جانتا ہے کہ جس قلم کی قسم خالقِ ارض وسمانے کتابِ حکمت میں کھائی ہے جس کی بنا پر قلم یہ کہنے میں حق بجانب ہے کہ ''من شاہِ جہانم'' سو اس کی حرمت کو کسی بھی قیمت پر بے وقار نہیں کرنا ہے،، محمد حسین کو بظاہر مملکت خداداد پاکستان سے گئے ہوئے ربع صدی ہو گئی ہے مگر اس کی تحریر کے شبد سطروں سے اٹھ اٹھ کر شہادت دیتے ہیں کہ حرام ہو جو اس نے ایک پل بھی اپنے وطن کو اپنے دل ودماغ سے نکالا ہو یا اس کی محبت

کو کسی طرح کے سمجھوتے کا شکار ہونے دیا ہو۔اس کی سوچ اور فکر کے سارے سوتے اپنی دھرتی کی محبت سے پھوٹتے ہیں اور اس کے شب و روز کے سارے دریچے اس ہوا کے رخ پر بنے ہوئے ہیں جو وطن کی یادوں سے معطر ہو کر آتی ہیں اور اشکوں سے منور ہو کر جاتی ہے، اس لئے اس کے قلم کے سارے زاویے اور اس کی ساری جولانیاں اپنے وطن کے نام ہوتی ہیں، مانو وہ سورج مکھی کی طرح پاکستان کی طرف رخ پھیرے رکھتا ہے اور جاننے والے جانتے ہیں کہ اس میں کوئی دوسری رائے نہیں ہو سکتی کہ محمد حسین جسمانی طور پر کہیں بھی رہتا ہو، وہ اول و آخر پاکستانی اور ایک سچا پاکستانی ہے اور اس کا دل اپنی جنم بھومی اپنی دھرتی کی محبت کی تال پر دھڑکتا ہے، اس لئے وہ بے خوف بات کرتا ہے، دوٹوک بات کرتا ہے وہ محنت کش شاعر تنویر سپرا کی طرح اس تجربہ سے نہیں گزرنا چاہتا جس کے بارے میں اس نے کہا ہے

اظہار کا دباؤ بڑا ہی شدید تھا
الفاظ روکتے ہی میرے ہونٹ پھٹ گئے

اظہار کا دباؤ کتنا بھی شدید ہو وہ نہ اس کا قلم الفاظ روکنے کا روادار ہوتا ہے۔ کیونکہ اسے لفظ کی طاقت کا بھرپور ادراک ہے اس لئے وہ لفظوں کے آگے مصلحت کے بند باندھنے کی بجائے انہیں ان کے فطری بہاو میں بہنے دیتے ہیں، مجھے اس کے کالم کے ساتھ بہت سا وقت گزار کے بہت اچھا لگا، میں بہت خورسند ہوا، محمد حسین کا کالم پہلی ہی ملاقات میں دوستی کا ہاتھ بڑھا کر پڑھنے والے کو فوراً اپنا طرفدار ہی نہیں گرویدہ بھی بنا لیتا ہے، اس کی خوشگوار نثر ادق موضوعات اور مشکل مباحث کو کہیں بھی بوجھل نہیں ہونے دیتی اور ایک کالم کے لئے نثر کا سلیس، لطیف اور پرتاثیر ہونا کتنا ضروری ہے

اس کا اندازہ محمد حسین کو خوب ہے، میں دیر دیر تک اس کی من موہنی اور پر کشش نثر کی گرفت میں رہا ہوں، دراصل مجھے وہ فنکار بہت متاثر کرتا ہے جو متاثر کرنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کرتا اور محمد حسین ایسے لوگوں کی فہرست میں کہیں بہت اوپر ہے، میں نے اسے بہت قریب سے ''پڑھا'' اور پرکھا ہے، دوسروں کو سکھ دینے کے لئے اپنے آپ کو ہر طرح کی اذیت کے لئے وہ ہمہ وقت تیار رہتا ہے، اس ''پہاڑی آدمی'' (یہ خطاب شاہد کا مریڈ کا دیا ہوا ہے) کی کچھ تو یہی فطرت اصلی ہے اور شاید کچھ اسی شاہد کامریڈ کی دوستی کی دین ہے، شاہد کامریڈ جو اپنے ساتھ بھی چند لمحات گزارنے کا روادار نہیں کہ وہ ذرا بھی دنیا دار نہیں اور جو بڑے بڑوں کو بھری محفل میں اپنی سفاک سچائی سے زیر کر دیتا ہے اور جو میری زندگی میری مرضی کہتے ہوئے پنی شرطوں پر اپنی زندگی گزارنے کا خوگر ہے وہ محمد حسین (جس کو وہ لاڈ سے دولہا میاں اور عظمیٰ بھابھی جسے وہ دلہن کہتا ہے اور جس کی دیکھا دیکھی ہم بھی ان دونوں سراپا محبت جوڑے کو دولہا دلہن ہی کہتے ہیں) اور دلہن کے از حد خیال رکھنے سے بھلے سے زچ بھی ہوتے ہوں مگر وہ جو تھوڑا بہت اپنا خیال رکھتے ہیں وہ پورے نیویارک میں صرف ان ہی کے کہنے پر رکھتے ہیں۔اور میں سمجھتا ہوں کہ محمد حسین محض شاہد کامریڈ ہی نہیں وہ اپنے ہر دوست کے دکھ سکھ میں اسی طرح دل و جان سے شریک ہوتا ہے جس طرح وہ پاکستان اور پاکستانیوں کے ساتھ ہنستا اور روتا ہے اور محمد حسین کے دکھ سکھ کے یہ دونوں اظہاریے اس کے خوبصورت کالمز میں ڈھل کر اس کی محبت بھری فکر کی تجسیم کر دیتے ہیں، اس کے کالمز جدید حسیات اور معروضی حالات کی ایک ضوبصورت تصویر بناتے ہیں جس کے خدوخال کچھ تیکھے ضرور ہیں مگر یہ آنے والے زمانے کے لئے اپنے عہد کی ایک

سچی گواہی کے طور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔
(2022 کے پہلے مہینے کی ساتویں شام)

مجھے ہے حکمِ اذان
کالم نگار: محمد حسین، نیویارک

ہم نے تو دل جلا کے سرِ عام رکھ دیا

ہم ایک مثالی معاشرے کے قیام کے جتنے خواہاں ہیں اتنے ہی ہم اپنے حصے کی کوئی شمع جلانے سے گریزاں بھی ہیں، ڈاکٹر زینت بی بی اس لحاظ سے قابلِ داد ہیں کہ انہوں نے اپنے حصے کی شمع بہت ہی دل سوزی سے لکھے ہوئے اپنے مضامین کے مجموعہ ''حرف شیریں'' کی صورت جلائی ہے، مجھے ان مضامین کے مطالعہ کے دوران رہ رہ کر خیال آرہا تھا کہ یہ جو ہم ایک مرعوب سی قوم میں ڈھل کر دوسروں کی ترقی کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتے ہیں اس کی وجوہات میں سرفہرست اپنے آپ سے غافل ہونا ہے، اپنے آپ کو نہ پہچاننا ہے گویا اپنے آدرش سے لاتعلقی ہے، اسلاف سے جس میراث کو گنوانے کی بات کل اقبالؒ نے کی تھی اس رایئگانی کے دکھ کا احساس ڈاکٹر زینت کے یہ مضامین پڑھ کر کچھ اور کچوکے دینے لگتا ہے اور یہی وہ ''شگفتنِ گلہائے ناز'' کا وقت ہوتا ہے جب اپنے آپ کا اور اپنے اعمال اور افعال کا جائزہ لینے والے گل بوٹے اندر سے پھوٹتے ہیں یہی وہ معرفت کی گھڑی ہوتی ہے جو اپنے رب سے قریب تر کر دیتی ہے ڈاکٹر زینت کو جو بہت ہی دلنشین اور شگفتہ نثر لکھنے کا ملکہ ودیعت ہوا ہے اور اس پر مستزاد اشعار کا برمحل اور ایک فطری بہاؤ کے ساتھ استعمال بہت سے بظاہر خشک مباحث میں ایک ادبی رچاؤ، چاشنی اور تاثیر پیدا کر دیتا ہے، ان مضامین کا

مطالعہ اگر ایک طرف طلبہ کی علمی ادبی پیاس بجھانے اور نصابی مباحثوں کے لئے ان کی ویکیبلری میں اضافہ کا باعث بنے گا، تو دوسری طرف ایک اسلامی فلاحی اور مثالی معاشرہ کے خدو خال بھی ان پر آشکارا ہونے لگیں گے یہ مضامین در اصل ہماری میراث اور وہ بھولا ہوا سبق ہے جس سے دوری نے ہمیں آج بندگلی کا راہی بن دیا ہے۔اور جن مضامین کو ڈاکٹر زینت نے قتیبل شفائی کی زبان میں یہ کہتے ہوئے دیکھنے والی آنکھوں، جاننے والے ذہنوں اور سمجھنے والے دلوں کے سپرد کر دیا ہے۔

اب جس کے جی میں آئے وہی پائے روشنی
ہم نے تو دل جلا کے سرِ عام رکھ دیا

(2023 کے دوسرے مہینے کی 8 ویں صبح)

حرفِ شیریں۔
مصنفہ ڈاکٹر زینت بی بی

بنیاد پرستی۔ایک آئینہ

اصل میں ہوتا کچھ اس طرح ہے کہ جب کہیں سے کوئی نئی بات، نئی ترکیب منطقی طور پر وجود میں آتی ہے تو پھر بعض اذہان میں ایک کھلبلی سی مچ جاتی ہے کہ اگر یہ کچھ اچھے معنوں اور مفاہیم میں ہے تو اسے اپنے کالر میں سجالیا جائے نہیں تو کسی اور کی آنکھ کا تنکا بنادیا جائے یہ سلسلہ اب کا نہیں حق و باطل کی یہ آویزش سلسلہ ماہ و سال میں شمار ہی نہیں کی جاسکتی تاریخ کی کتابوں کے بہت سے اوراق ان آویزشوں کا حال سناتے ہیں۔
شبلی نعمانی نے جو کتب خانہ سکندریہ کے حوالے سے ایک بہت ہی معتبر تحریر لکھی ہے۔اس میں بھی یہ تصویر واضح نظر آتی ہے کہ کس طرح متعصّب عیسائیوں نے کتب خانے کی بربادی مسلمانوں کے کھاتے میں ڈال دی۔
حالانکہ تاریخی حوالے اور شواہد کچھ اور ہی کہانی سناتے ہیں دکھ محض اس بات کا ہے کہ اس طرح کی حرکتیں وہ لوگ کرتے ہیں جو بزعم خود پڑھے لکھے مئورخین و تاریخی سکالر ہیں اور یہ سب مذہب سے زیادہ علم کے نام پر اور بے معنی دلیلوں کے زور پر کیا جارہا ہے بجائے اس کے کہ ان حوالوں سے ذہن انسان میں موجود گتھیاں سلجھائیں، نئے مسائل اور نئی الجھنیں پیدا کررہے ہیں نتیجہ یہی ہے کہ بے حاصلیاں نوع انسانی کا مقدر بنتی چلی جارہی ہیں۔

کل اقبال نے کہا تھا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

مگر اب اس کا کیا کیا جائے کہ یہی بیر یہی تعصّب یہی نفرتیں نوعِ انسانی کو مزید الجھنوں، پریشانیوں کے دلدل میں دھکیل رہے ہیں۔

بنیاد پرستی کیا ہے یہ سلسلہ کہاں سے شروع ہوا اس کے بارے میں کتب کیا کہتی ہیں۔ فرہنگ کیا تصویر بناتی ہے انسائیکلو پیڈیا کس طرح کی رہنمائی کرتا ہے علماء کرام کیا سوچتے ہیں فیلسوف کیا نتیجہ اخذ کرتے ہیں اور ایک عام شخص اسے کس عینک سے دیکھتا ہے اس پر کتنی بھی بات کی جائے بحث کی جائے بعض حقائق جو بعض حلقوں کے لئے تلخ بھی ہوسکتے ہیں اور بعض دلیلیں، جو بعض لوگوں کے لئے ناقابل قبول بھی ہوسکتی ہیں۔لیکن بایں ہمہ یہ بات طے ہے جو سچ ہے جو حقیقت ہے اس سچ کا آئینہ اس کتاب میں موجود ہے۔

نورحکیم جیلانی نے اسے قطعاً جذباتی انداز سے نہ سوچا ہے نہ لکھا ہے بلکہ تاریخی شواہد سے زیادہ اور مذہبی حوالوں سے زیادہ ایک ایسا نکتہ نظر سامنے لانے کوشش کی ہے جسے عام ذہن انسانی بھی آسانی سے قبول کر سکے۔

اس نوجوان کی اس کاوش کو اس لئے بھی پزیرائی بخشنی چاہئے کہ اس کے پسِ پردہ اس کا جذبہ خالصتاً انسانی رویّوں کی عظمت کا ہے۔

میں تو محض اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

بنیاد پرستی کی حقیقت

مصنف: ڈاکٹر نورحکیم جیلانی

ہر جا جہانِ دیگر است

جب میں اپنے دوستِ عزیز اور معروف و مقبول معالج ڈاکٹر طارق مفتی کی خودنوشت کا مسودہ پڑھنے بیٹھا، تو پتہ چلا کہ صرف ایک شہر پشاور تک بات محدود نہیں یہ جواں رعنا تو دنیا بھر میں جہاں جہاں بھی گیا، جس شہر میں بھی قیام کیا شہر اس کے لئے اپنے راستے کھولتا رہا اور کامیابیاں اور کامرانیاں مسلسل اس پر سایہ فگن رہیں، اور اب جب وہ بیتے دنوں کو یاد کرنے بیٹھا تو بیتا ہوا سارا وقت جیسے اس کے کانوں میں سرگوشیاں کرنے اس کے پاس آ بیٹھا، اور طارق مفتی ایک باکمال تخلیق کار کی طرح اپنے دھوپ چھاؤں ماضی کو کاغذی پیراہن پہنانے لگے، ویسے تو انہوں نے یہی لکھا ہے کہ وہ سکول سے کالج کے زمانے تک ڈائری لکھتے رہے مگر بعد میں یہ عادت ترک کر دی لیکن طارق مفتی کی تحریر اس بات کی چغلی کھا رہی ہے کہ وہ پڑھنے کی طرح لکھنے سے بھی جڑے رہے ہیں، پھر ان کا طرزِ تحریر بلا کا شگفتہ ہے اور وہ اپنی کہانی کو کسی بھی لمحہ خشک اور بے مزہ نہیں ہونے دیتے، اور یہ کام وہ لفظوں کی نشست و برخاست سے بنائے گئے اور پڑھتے ہی دل میں اتر جانے والے فقروں سے لیتے ہیں اور پڑھنے والے جو ان کی کہانی میں کھوئے ہوتے ہیں اچانک ہی ان کے ہونٹوں پر تبسم لے آتے ہیں طارق مفتی اپنی مجلسی زندگی میں بھی ہمہ وقت اپنے ہونٹوں پر ایک دھیمی دھیمی

سی دل موہ لینے والی مسکراہٹ سجائے رکھتے ہیں ان کی یادداشتیں پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنی دھیمی اور گدا گداتی مسکان اپنی تحریر پر چھڑک دیتے ہیں جس کی وجہ سے اس خودنوشت کے میڈیکل کی دنیا کے سنجیدہ اور عام قاری کے لئے بظاہر خشک قصے بھی پڑھنے والے کے طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیتے ہیں لیکن ان کی تحریر کتنی بھی شگفتہ ہو کتنے بھی ہلکے اور مزاحیہ پیرایہ میں اظہار کیا جارہا ہو گویا پشاور کے سنہرے کل کی بات ہو یا پھر ہندکو زبان کے چٹخارے دار روزمرہ اور محاورں کا بیان ہو جن پر دل کھول کر ہنسنا پڑتا ہے مگر یہ بھی اتنا ہی سچ ہے طارق مفتی کی تحریر میں ایک زیریں لہر اداسی کی بھی ساتھ ساتھ چل رہی ہوتی ہے کہ کل کا وہ دلبر و دلدار اور طرحدار پشاور کہاں کھو گیا ہے، اس خودنوشت کے ساتھ میں نے جتنا وقت بھی گزارا میں ایک لمحہ بھی اس کے سحر سے نہیں نکل سکا، کسی غزل کے اچھے اشعار کی طرح میں نے قدم قدم پر رک رک کر ان نثر پاروں کو بار بار پڑھا جو پڑھنے والے کو آگے نہیں بڑھنے دیتے حالؔی نے لگتا ہے اسی خودنوشت کے بارے میں کہا ہے ''دلکش ہر ایک قطعہ صحرا ہے راہ میں'' ہر صفحہ پڑاو کا متقاضی ہے بلکہ اس خودنوشت میں طارق مفتی کے بے ساختہ لکھے ہوئے پر تاثیر فقرے بار بار مجھے نظیؔری نیشاپوری کا شعر یاد دلاتے رہے

ز فرق تا قدمش ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

اس خودنوشت میں بھی بنیادی کردار اسی شہر طرح دار پشاور کا اور اس کے گلی گلیاروں ،کوچہ و بازاروں اور مٹتے ہوئے آثاروں کا ہے جن میں طارق مفتی کے بچپن کی معصومانہ شرارتیں اور لڑکپن کے لا ابالی پن سے لے کر جوانی کے کھلنڈرے پن تک

کے سارے قصے کرایک داستان ہوشربا بنا دیتے ہیں، پشاور کے سنہرے دور کا قصہ پڑتے ہوئے تو یوں لگتا ہے کہ جیسے قدیم قصہ خوانی کے کسی قہوہ خانہ میں کوئی مشاق داستان گو مسافروں کی تھکن اتارنے کہانی سنا رہا ہے، میں پڑھتے ہی دل میں اترنے والی اس تحریر کا طارق مفتی کی خودنوشت صرف اس لئے کہہ رہا ہوں کہ وہ اسے اپنی آپ بیتی قرار دے رہے ہیں بلکہ وہ تو ہر آپ بیتی کو''ادھ بیتی'' اس لئے قرار دیتے ہیں کہ بلاکم وکاست اپنی کہانی سنانے کا متحمل کوئی بھی نہیں ہوسکتا کیونکہ اس میں ایک نہیں کئی ایک سخت مقامات آتے ہیں، لیکن یہ کتاب بیک وقت خودنوشت بھی ہے سفرنامہ بھی اور تذکرہ بھی ہے، سفرنامہ انگلینڈ کا ہو یا سڑک کے راستے حج کا بے پناہ قوّتِ مشاہدہ کی وجہ سے ڈاکٹر طارق مفتی ویڈیو فلم کی طرح آنکھوں کے سامنے چلتی پھرتی تصویریں بناتے ہیں، اصفہان کے اس حمام کا قصہ تو ''اے تھنگ آف بیوٹی۔۔کے ذیل میں آتا ہے جب کم روشنی میں سب اکٹھے نہارہے تھے مگر تیز روشنی میں گیلے تولیے کو خشک تولیہ سے بدلتے ہوئے طارق مفتی نے وہ لمحہ بھی اپنی تحریر میں کیپچر کرلیا جب اس عمل میں گیلا تولیہ اس کے بدن سے کھینچ لیا گیا اور خشک تولیہ بھی بروقت ان کے ہاتھ نہیں آسکا تھا یوں اس حمام میں سب نہیں وہ اکیلے ہی ننگے کھڑے تھے، اس طرح کے شوخ فقروں سے ہر قدم پر آپ کو گدگداتے رہتے ہیں وہ قصہ انگلیند میں لیٹر بکس کا پھلیکا ہو یا پھر حج کے موقع پر شیطان کا انسان کی دسترس میں آنے کا مریضوں کا احوال بیان کرنا ہو یا ڈاکٹر زمارکیٹ کا قصہ ان کا ذکر اتنی خوبصورتی سے کیا ہے کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے، بعض واقعات تو بے اختیار آنکھوں میں دھواں بھر دیتے ہیں جیسے جب وہ گھر کے لئے اپنی کمائی سے فریج خرید کر لائے تھے تو لکھتے ہیں کہ جب تک فرج رہا

میری والدہ ہر آنے جانے والے کو بتاتی رہیں کہ یہ اس کا بیٹا لایا ہے، سچی بات یہی ہے کہ اس تحریر کو بار بار پڑھنا مجھے بہت اچھا لگا کیونکہ ہر بار مجھے بھی میرؔ کی طرح یہ احساس ستاتا رہا کہ

سر سری تم جہاں سے گزرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

کلام ناتمام
ڈاکٹر طارق مفتی

میں بحرِ زندگی کا اک تعجب خیز ساحل ہوں

ایک گونہ دلچسپی تو مجھے 'مطلعِ نو' سے یوں ہوئی کہ اس بہت عمدہ شعری مجموعہ کے تخلیق کار شاعرِ خوش نوا آئینہ صفت محمد اکرم عزؔم کے شعر نے پشاور کی اُس زرخیز ادبی فضا میں پر پرواز کھولے جو قاضی عمر قضا، ضیا جعفری احمؔد فراز کے والد آغا برق کوہاٹی اور فارغ بخاری سمیت کئی بے بدل شعرا کی جولان گاہ تھی اور جہاں جاننے والے جانتے ہیں کہ بے ہنروں کے پر جلتے تھے اس فضا میں محمد اکرم عزم کا پورے قد سے کھڑا ہونا اور بزمِ ہنراں میں بار پانا ہی ان کے باکمال شاعر ہونے کا ثبوت ہے، شگفتہ زباں پشاور ایک تہذیبی اور طرح دار شہر ہے اور اس شہر کی بھید بھری گلیاں کم کم ہی کسی کو اپنا نقشہ حوالے کرتی ہیں اس لئے رہنے کو یہاں لوگ آتے ہیں، رہتے ہیں اور چلے جاتے ہیں اور یہ بھی سچ ہے کہ وہ باہر جا کر بھی پشاور کو ضرور یاد کرتے ہیں جیسے شوکت واسطی نے اسلام آباد جا کر کہا تھا

ٹوٹا ہی نہیں ہے ذہنی و قلبی رشتہ
شوکتؔ اُس شہرِ پشاور میں قیام ایسا تھا

لیکن یہ بھی سچ ہے کہ پشاور صرف ان کو یاد کرتا ہے جو اپنے قیام کے دوران اس شہرِ طلسمات میں خود کو بھول بیٹھے ہوں اس لئے میں سوچ رہا تھا کیا محمد اکرم عزؔم کا شمار

بھی ان لوگوں میں ہوتا جنھیں پشاور یاد کرتا ہے۔اس سوچ کے ساتھ میں نے مطلع نو' کی بلندیوں سے پشاور کو دیکھنا شروع کیا تو اچانک ان کی نظم 'تیرے شہر کو دیکھ کر' نے مجھے اپنی بانہوں میں بھر کر سرگوشیاں شروع کر دیں

یہ شہر میری محبت کا رازداں تھا کبھی
یہ شہر جس میں ترے ہاں میں میہماں تھا کبھی
یہ شہر جس میں کٹی تھیں طرب فزا راتیں
یہ شہر جس میں ہوا کرتی تھیں ملاقاتیں

واہ۔کیا عمدہ نظم ہے رواں دواں، دوستی کرتی ہوئی، تصویریں بناتی ہوئی نظم کا ایک ایک مصرع میں بسر کرنے لگا تو یکلخت مجھے ایک مصرع، نظیرؔی کی معروف غزل کے لہجے میں بتانے لگا کہ ''جا اینجاست'' اور یہی مصرع میرے فربہ ہوتی ہوئی سوچ کا جواب تھا

یہ شہر جس میں خبر اپنی بھی نہ تھی مجھ کو

بس پشاور اس طرح مسحور کر کے اپنا اسیر بنا دیتا ہے خود مجھ سے بھی نصف صدی پہلے ایک عام سی شام گاؤں جانے والی آخری بس چھوٹ گئی تھی تب سے یہیں ہوں اور خود کو ڈھارس دیتا رہتا ہوں

کچھ شہر کی شاموں میں بھی اک سحر تھا ناصرؔ
کچھ گاؤں کی صبحوں نے بھی ہم کو نہ پکارا

اور اب یہ قطعاً حسنِ اتفاق نہیں ہے یہ یقیناً پشاور کی کشش ہے یا پھر شاید اس خود آگاہ شاعر اور درویش صفت محمد اکرم عزؔم کی کرامت کہ جس شہر میں وہ خود کو کبھی گم کر بیٹھے تھے اُن کو از سرِ نو دریافت کرنے کا علم اٹھا کر انہی کے فرزندِ ارجمند شاعر، محقق و نقاد

ڈاکٹر عبید بازغ امر آج کل اُسی شہر ہوشربا پشاور میں ہیں، جنھیں اگر کچھ قلق ہے تو بس اتنا کہ ایک نابغۂ روزگار شاعر، ادیب، فلسفی اور اردو فارسی پر ہی نہیں انگریزی، پنجابی اور پشتو زبان پر بھی یکساں عبور رکھنے والے قد آور شاعر کو قلمروئے ادب کے باسی کیوں بھلا بیٹھے ہیں۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ محمد اکرم عزم نے پشاور اور راولپنڈی کے دبستانوں کو پروان چڑھانے میں اپنا خون جگر دیا ہے، پشاور سے ادبی جریدہ التہذیب اور راولپنڈی سے ثبات جاری کرنے والے درویش شاعر محمد اکرم عزم کو کیا محض اس لئے یاد نہیں رکھا جارہا کہ انھوں نے خود کو ادیبوں کے باہمی چپقلش کے نتیجے میں بننے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے والی تنظیموں کا حصہ بننے سے انکار کر دیا تھا، مان لیجئے کہ دو بڑے شہروں کے 'دبستان' محمد اکرم عزم جیسے ایجاز سے اعجاز پیدا کرنے والے معجز نگار شاعر کے مقروض ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ نظم اور غزل کے اس بے پناہ شاعر کی شہرت بس اب ان کے کلام اوراقِ پریشاں کے انتخاب کی اشاعت کی دوری پر ہے جس کے بعد، مجھے یقین ہے کہ ہر زباں پر اس نوع کے مرصع اشعار رواں ہوں گے

ہر نظر خوبیٔ نظارہ سے حیرت میں ہے
مطلعِ حسن ہے واللہ سراپا کیا ہے

عطا کرنا ہی تھا گر ذوقِ نظارہ نگاہوں کو
نگاہوں کے مطابق ایک منظر بھی دیا ہوتا

امینِ رازِ قدرت ہوں رہینِ رنج و مشکل ہوں
میں بحرِ زندگی کا اک تعجب خیز ساحل ہوں

ذرا دم لینے دے اے شوخیٔ حسنِ ستم پیشہ
بڑی مدت میں مر کر آج میں ان کے مقابل ہوں
(عبیؔد بازغ)

خیالاتِ پریشان
محمد اکرم عزم

ایک پھول اور مہکا

ہم کہ قلم اور کاغذ سے رشتہ استوار کیئے انسان ہیں کسی بھی موڑ پر اپنی زمین اپنے لوگوں سے جدا نہیں ہوتے ان کے احساسات محسوسات جذبات کیفیات کو نظم کرتے رہتے ہیں ضبط تحریر میں لاتے ہیں نامہربان موسموں غم انگیز رتوں کے بیان میں کوتاہی نہیں کرتے زندگی کی شادابیوں رعنائیوں کے سنگ دکھی دلوں کو حوصلہ دیتی عبارتیں رات بھر کی عبادتیں بیتے زمانوں کی سب کہاوتیں ہماری محبتیں سوچوں کو جگمگاتی ہیں تو آنکھوں میں نئی جوت جگاتی ہیں اور وہی رقم ہوتا ہے جو ارد گرد ہو رہا ہوتا ہے ہمارے پیاروں کے ساتھ پیش آ رہا ہوتا ہے شاہدہ سردار کی شاعری میں بھی اپنے اور اپنے پیاروں کی بات کی گئی ہے انداز بیان لہجہ لفظیات، محاکات، تراکیب، استعارے سادہ ہیں اور یہی ان کا میٹھا مسکراتا مزاج ہے جس کی انہوں نے نہایت دلنواز عکاسی کی ہے میں ان کے بہترین اور روشن مستقبل کے لئے دعا گو ہوں۔

''ہوا کی سرگوشی'' شاہدہ سردار

اجالا ہی اجالا ہے

آج نظم کو اردو دنیا میں جتنی سنجیدگی سے برتا جا رہا ہے اس کی مثال ماضی کے ان ادوار میں بھی نہیں ملتی، جب نظم نے ایک تحریک کی شکل میں اپنے لیے اظہار کے راستے تراشے اور تلاشے تھے۔ نظیر اکبرآبادی کے انفرادی تخلیقی وفور یا محمد حسین آزاد کے زمانے کے مشترکہ شعور نے بعض مضبوط اور دیرپا نقوش ضرور ثبت کیے ہیں مگر پورا سچ یہ ہے کہ آج کے دور کی بے چہرگی، بے سمتی، بے یقینی اور تیزی سے بڑھتے ہوئے احساس بیگانگی کی سی اذیّت سے وہ اتنی شدّت سے دو چار نہیں ہوئے تھے جس کا سامنا آج کے تخلیق کار کو ہے پھر یہاں تک آتے آتے جن وادیوں گھاٹیوں میدانوں اور صحراؤں سے ہو کر نظم پہنچتی ہے اس نے بھی نظم میں جدید دور کے شعراء کو اپنی تمام تر تخلیقی توانائیوں اور حسی تجربوں کو شدت کے ساتھ برتنے پر مجبور کر رکھا ہے اگرچہ ادب کی دنیا میں نئی قدروں اور نئی جہتوں کا تعین حتمی طور پر کرنا تو ممکن نہیں ہے تاہم روایت کے تسلسل اور تواتر میں جب بدلتی ہوئی حسیات کی دھند چھٹتی ہے تو کچھ ڈھلی ڈھلائی نئی قدریں بھی دامن دل کھینچ لیتی ہیں، یہ نئی قدریں اجتماعی شعور کا حصّہ بھی ہو سکتی ہیں اور انفرادی تجربات کا قصّہ بھی ہو سکتی ہیں ان حوالوں کو ذہن میں بسائے ہوئے جب میں جواں فکر عامر بیگ کی نظموں کو بسر کر رہا تھا تو میں اس کی نظم

کے البم میں اس کے انفرادی جذبات کی تصویریں بھی دیکھ رہا تھا جس میں اس سے کھوئی ہوئی محبت کے کھٹے میٹھے زمانوں کی بازگشت سنائی دے رہی تھی مگر میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ وہ گردوپیش کے بے لگام اور سفاک جبر کا کریہہ چہرہ بھی اپنے لوگوں کو دکھا رہا ہے اور اپنے دور کی بے انصافیوں کو آنے والے زمانوں کے لئے تاریخ کی صورت محفوظ بھی کرتا جا رہا ہے کل کی محبت کی کہانیاں سناتے سناتے اسے جب جب اسے آج کی بے حس حسیات سے مملو کٹھور رو‌ّیوں کی چاپ سنائی دیتی ہے تو اس کا لہجہ تلخ نہ بھی ہو تو کھردرا ضرور ہونے لگتا ہے وہ ایک سچا تخلیق کار ہے جس وقت آج کے دور کی بے یقینی اس کے سانس چھوٹے کرنے لگتی ہے تو یہ اذیت خود کلامی کا چولا پہن لیتی ہے۔

شام ڈھلتی ہے
پرندے لوٹ جاتے ہیں
ہم کہاں لوٹیں ہم کہاں جائیں

لیکن اپنے لوگوں کے دکھ سکھ میں ان کے شریک عامر بیگ کو بالآخر اس سوال کا جواب مل جاتا ہے کہ بھلے سے ہم نہ جانیں کہ ہم کہاں جائیں مگر ہماری اس محرومی، بے بسی اور بے کسی کے ذمہ دار بخوبی جانتے ہیں کہ انہیں شام ڈھلتے ہی کدھر کا رخ کرنا ہوتا ہے پھر اس سچ کو وہ پوری دیانت داری کے ساتھ وہ نظم کر دیتا ہے

شام ڈھلتے ہی
پرندے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں
اور وائٹ کالر کریمنلز

ہوٹلوں، کلبوں، قحبہ خانوں شراب خانوں کا رخ کرتے ہیں

ہر اچھے نظم گو کی طرح عامؔر بیگ بھی جانتا ہے کہ نظم کے معبد میں داخل ہونے سے قبل ایک بار اپنے گرد و پیش کا جائزہ لینا ہی نہیں محاکمہ بھی کرنا پڑتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ اس کی اپنی تخلیقی قوت، نیا طرز احساس، ذاتی تجربات کا پشتارہ، خارج کی تلخ و شیریں سچائیاں، فکر و تخیل کا امتزاج اور اپنے دور کے مشترکہ شعور کا اثاثہ اس کی تخلیقی پوٹلی میں بندھا ہوا ہے یا نہیں، محبتوں کے سارے دکھ مجھے کہانیوں کی طرح اس کی نظموں کے پیکر میں سانس لیتے نظر آتے ہیں وہ اپنی کھوئی ہوئی محبت کی کتھا چھیڑیں یا اپنے لوگوں سے غیر مشروط محبت عہد نامہ ترتیب دیں اس کی ہمیشہ کوشش یہی ہوتی ہے کہ

''اب ہم جب بھی لکھنے بیٹھیں
لفظ کوئی بھی بھدا نہ ہو
سوچ رہا ہوں لکھنے والے
اڑنے والے ہوتے ہیں''

اس عمدہ مجموعہ میں کچھ نظمیں تو ایسی ہیں کہ آنکھوں میں دھواں بھر دیتی ہیں، چپ کرا دیتی ہیں اور پھر دیر دیر تک اپنی بانہوں میں بھر کر ہلا را دیتی رہتی ہیں ایسے نظموں میں '' تم بن''، محبت کا نغمہ'' '' مجھے گلفام کر دو نا'' '' پہلا گیت'' '' ہجر و وصال'' اور اندھیرا اجالا ہے'' کی طرح نظمیں شامل ہیں عامر بیگ اس دنیا کو خوبصورت دیکھنے کا خواہشمند ہے جس کے لئے اپنی نظم '' فردِ واحد'' کے آخری مصرع میں اس نے اس کا ایک آسان حل بھی بتا دیا ہے۔

''رب کی دنیا اچھی کر دوں۔۔۔۔جبکہ اچھا سوچوں تو''

محبت استخارہ ہے جیسے عمدہ شعری مجموعہ کا خالق عامر بیگ شعر بھی کہتا ہے،افسانوں کے مجموعہ 'مانتو' کی شکل میں ایک بے پناہ کہانی کار کی طور پر بھی خود کو منوا رہا ہے اب پر تاثیر نظموں کا مجموعہ بھی لے آیا ہے جو باقاعدگی کے ساتھ اپنے گھر میں حلقہ ارباب ذوق پسکاٹ وے کی شاندار اور یادگار نشستوں کا بڑے پیمانے میں اہتمام بھی کرتا ہے، پھر دوستوں کے لئے دل اور گھر کے دروازے بھی ہمیشہ کھلے رکھتا ہے، ''کار ادب'' کو دنیا کے ہر کام پر ترجیح دینے والے عامر بیگ کے بارے میں اگر اس کی نظم ''اندھیرا اجالا'' کے آخری مصرعوں سے مدد لوں تو بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ مجی عامر بیگ 'اجالا ہی اجالا ہے'۔۔۔۔

''تیرے ہوتے میری جانم
یہ عامر بھی سویرا ہے
اجالا ہی اجالا ہے
سویرا ہی سویرا ہے''

2025 کے پہلے مہینے کی 16 ویں صبح

محبت خدا ہے
شاعر: ڈاکٹر عامر بیگ

ممنوعہ منطقوں میں جنم لینے والی ان کہانیاں

’’یہ جو سچا تخلیقی وفور ہوتا ہے یہ ہمیشہ پائمال راستوں سے ہٹ کے سانس لینا پسند کرتا ہے دیکھے بھالے منطقے اسے ایک آنکھ نہیں بھاتے ،اس لئے ناہموار راستوں پر بھی اس کا بہاؤ دیدنی ہوتا ہے میں نے جب جواں فکر افسانہ نگار گلزار دانش کی کہانیوں کے چوپال میں کچھ وقت گزارا میری آنکھوں میں گزشتہ کل کی وہ پنچایتیں رڑکنے لگیں جب اپنے گاؤں کے صاف شفاف اور پاکیزہ ماحول کو برقرار رکھنے کے لئے تمام تر مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر انتہائی مشکل فیصلے بہت سہولت سے کر لئے جاتے تھے مجھے حیرت ہوئی کہ جواں سال و جواں فکر گلزار دانش کو ابھی سے بستی میں رہنے والے سانپوں کو رام کرنے کا ایسا منتر ودیعت ہو چکا ہے کہ وہ پوری صلاحیت کے ساتھ ممنوعہ منطقہ میں جنم لینے والی کہانیوں کی بانبی میں بےخوفی سے ہاتھ ڈال رہا ہے، وہ اونگھتی راہداریوں کی نیم وا آنکھوں میں منجمد ہونے والے مناظر کو آسانی سے ’ڈی کوڈ‘ کرنے کا ہنر جان چکا ہے،اس کی کہانیاں رشتوں کی پیچ در پیچ گلیوں میں شام کے بعد کے پھیلتے ہوئے اندھیرے کی سرگوشیوں کے ذائقے بھی چکھانے پر قادر ہیں، اس کی ایک کہانی نے تو میرے ساتھ وہی سلوک کیا جو افتی نسیم کی نظموں کے مجموعہ نرمان کے دیباچہ نے کیا تھا،’’تو کیا یہ زندگی کی صلیب مجھے عمر بھر اکیلے ہی اٹھانا ہوگی‘‘ میں نے

جب ایک شام افسانہ میں گلزار دانش کا پہلا افسانہ سنا تھا تو مجھے لگا کہ نوجوان کے پاس کہانی بننے کا فن بھی ہے، دیکھنے والی آنکھیں بھی ہیں اور اسے یہ بھی علم ہے کہ افسانوی ادب کا اسلوب لاکھ تمثیلی سہی اس کی اساس ایک تلخ حقیقت پر استوار ہوتی ہے، اور اب جب ''گمان سے بیاں تک'' کے افسانوں کے ساتھ میں نے کچھ وقت گزارا تو مجھے یقین سا ہو چلا کہ اس کھلنڈرے بالک کو جلد ہی وہ جگہ ملنے والی ہے جہاں سے اس کی آنکھیں پارسائی کی دھند میں لپٹی اس دنیا کے سارے ناٹک آسانی سے دیکھ پائیں گی۔'' موسم مہرباں ہو یا زیادہ مہرباں نہ بھی ہو کار ادب کے لئے ہر موسم مناسب ہے کیونکہ باہر کے موسم تو آتے جاتے رہتے ہیں اور جس طرح یہ موسم ہوتے ہیں شاعر کو یہ اس طرح نظر نہیں آتے، قتیل شفائی یاد آ گئے۔

دور تک چھائے تھے بادل اور کہیں سایہ نہ تھا
اس طرح برسات کا موسم کبھی آیا نہ تھا

گمان سے بیان تک
کہانی کار۔ گلزار دانش

سنا ہے دے صدائیں تو بہاریں لوٹ آتی ہیں

اور اب تو ہم ایک ایسے زمانے میں سانس لینے پر مجبور ہیں جہاں چاروں اور شور اور بس شور ہی کی حکمرانی ہے اب ہمیں دوسرے تو ایک رہے اپنے کان تک اپنی آوز پہنچانے کے لئے بھی ہمیں چیخنا پڑتا ہے چہروں پر تناؤ بڑھتا جاتا ہے اور سکون کی دو گھڑیاں بھی کسی کو میسر نہیں ہیں لیکن حیرت ہے کہ کوئی بھی اس شور سے اکتا تا نہیں ہے اسی شور میں البتہ ایک دھیمی اور مہذب آواز ابھرتی ہے یہ ایک طرح دار شاعر کی آواز ہے جو شور کا نوحہ پڑھتے ہوئے اپنے شعر میں مسلسل روٹھی ہوئی چپ کو آوازیں دیتے دکھائی دیتے ہیں، مجھے اس ادبی دیو ڈاکٹر نثار ترابی کی علمی اور ادبی فتوحات کا ذکر نہیں کرنا اگر کرنے بیٹھوں تو جانے کتنے دفتر درکار ہوں، کیونکہ وہ صرف شاعر ہی نہیں معتبر اور مستند محقق اور نقاد بھی ہیں ایک جیّد عالم اور اردو زبان وادب کے استاد بھی ہیں جب کہ پنجابی شعر وادب بھی ان کے تخلیقی منطقہ کا ایک تناور درخت ہے، ڈاکٹر نثار ترابی اپنی تمام تر حکمت دانائی اور کمال فن کے باوجود سر تا پا عجز وانکساری کا ایک پیکر ہیں ،اپنی ذات سے ہٹ کر دوسروں کے لئے سوچنے والے ڈاکٹر نثار ترابی اس ہنگامہ خیز، پرشور اور کٹھور دور میں میرے نزیک صحیح معنوں میں شرافت، نفاست اور ذہانت کا سمبل ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ یہ جو آج ہر سو شور بڑھ گیا ہے بڑھتا چلا جا رہا ہے اور اس

کے اثرات ادب کے فکری منظر نامہ کو بھی اپنے رنگ میں رنگنے لگے ہیں جس کی بنا پر جدید شاعری میں فکر کی سنجیدگی اور گھمبیرتا کی بجائے چیختے چلاتے لفظوں اور سستی جذباتیت کی اجارہ داری بڑھتی جا رہی ہے اس کا ادراک کم بہت کم شعرا کو ہے پھر بھی جن کم کم شاعروں کو معاملہ کی نزاکت اور جانے انجانے میں ہونے والے ادب کے اس نقصان کا علم ہے ان میں سے ایک نمایاں نام ڈاکٹر نثار ترابی کا بھی ہے جس نے اپنے شعر کو اس پرشور دور کی ہوا نہیں لگنے دی۔ ان کا شعر روایت کی پاسداری کی ذمہ داری بھی نبھاتا ہے اور جدید حسیات کی روشنی سے مملو بھی ہے نثار ترابی اپنے فکری اور شعری منظر نامے میں بے یقینی، بے چہرگی اور بے معنی شور سے آلودہ اپنے آج کے دکھو ل کے رنگ تو ضرور بھرتے ہیں مگر اس لئے نہ تو تہذیب کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹتا ہے نہ لہجہ تنک ہوتا ہے اور نہ ہی وہ لاؤڈ ہوتے ہیں ان کا شعر ان کے مزاج کا آ'ئینہ دار ہے ان کا شعر اس بے معنی شور کے خلاف ایک ڈھال بن جاتا ہے اور ان کے فکری منظر نامہ میں ''چپ'' ''لب بستہ'' ''سکوت'' ''کم کم'' ''چپ چاپ'' ''گم'' ''خموشی'' ''خود سے گفتگو'' ''صدائیں'' ''چشم حیرت'' ''شہر تحیر'' ''روزن خواب'' ''بے معنی'' اور ''خواب سرا'' جیسے اظہاریے رنگ بھرتے نظر آتے ہیں یہ ساری کیفیات سرگوشی، کومل لہجے اور شائستہ گفتگو کا حوالہ ہیں، وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اس بے چینی بے حسی اور پرشور ہنگاموں کی وجہ کیا ہے

ہے جس پر منحصر ساری گواہی
کہانی کا وہی کردار چپ ہے

گزشتہ کل انہوں نے اپنا شعری مجموعہ ''ہر صدا مسافر ہے'' کے نام سے موسوم کیا تھا اور

آج انھیں ''خوشبو آواز دیتی ہے'' گویا یہی آوازیں ہیں جوان کی ہمزاد بھی ہیں اور ہم سفر بھی

سکوتِ گنبدِ جاں میں عجب طلاطم ہے
نجانے کتنی صدائیں ہیں ہم سفر میری

میں نے کہا ہے نا کہ ڈاکٹر نثار ترابی اس پرشور اور کٹھور دور میں روٹھی ہوئی چپ اور سکون کے لمحوں کو مسلسل آوازیں دے رہے ہیں کیونکہ ان کے اندر اس امید کا دیا روشن ہے کہ

سنا ہے رُت کی ہستی کا بھی اپنا وقت ہوتا ہے
سنا ہے دے صدائیں تو بہاریں لوٹ آتی ہیں

2025 کی جنوری کی 23ویں شام

خوشبو آواز دیتی ہے
شاعر۔ڈاکٹر نثار ترابی

چراغِ عشق

جن تخلیقی لمحوں میں شعر دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہے تو اعصاب کا کھچاؤ جان لیوا ہوتا ہے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو جاتی ہیں لیکن جب شعر روٹھ جاتا ہے اور دل خالی خالی سا رہ جاتا ہے تو رائیگانی کا احساس امر بیل کی طرح جسم و جاں سے لپٹ جاتا ہے۔ اور یہ وہی گویم مشکل وگرنہ گوم مشکل والی کیفیت ہے۔شعر کا نیا آدمی آج اساتذہ کی نسبت ایک مختلف حسیات کے زمانے میں سانس لے رہا ہے، جہاں نجی واردات کو اجتماعی شعور سے جوڑنے کی راہ میں کئی عفریت منہ کھولے کھڑے نظر آتے ہیں، مگر جب کہیں کہیں سے شاؔہ غزالی کی طرح ایک توانا اور دل خوشکن آواز سنائی دیتی ہے تو 'ہمارے بعد اندھیرا نہیں اجالا ہے' پر یقین پختہ ہو جاتا ہے۔

یہ کل کی بات ہے جب ان کے شعری مجموعہ ''غزالیات' نے قلم قبیلہ کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا، مگر سراپا محبت شاؔہ غزالی اس پڑاؤ پر رکے نہیں اور آگے کا تخلیقی سفر'' چراغِ عشق'' کی روشنی میں جاری رکھا،، لکیروں اور لفظوں کا نبض شناس شاہ غزؔالی اس حقیقت کو جان چکا ہے کہ اپنے لوگوں سے بات کرنے کے لئے نہ اپنے شعر کو فلسفہ کا جامہ اوڑھانا ہے نہ لکیروں کو ایسا گورکھ دھندا بنانا ہے کہ جسے ڈی کوڈ کرتے کرتے صدیاں ہلکان ہو جائیں۔

انھیں علم ہے کہ شعر یا تصویر کو نجی احساس اور انفرادی شعور سے مملو کر کے اپنی شخصیت کا اٹوٹ انگ بنادیا جائے تو شعری ریاضت سپھل ہو جاتی ہے۔ یہ جو شاہ غزالی کا شعر اپنے قاری سے بے تکلفی سے بات کرتا ہے یا ان کے شعروں کی سادگی میں چھپی پر کاری پڑھنے والے کا دل موہ لیتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ شاہ غزالی نے اپنے شعری نگارخانے کے دروازے پر 'نو انٹری' کا بورڈ نہیں لگنے دیا۔

شاہ غزالی کے نئے شعری مجموعہ 'چراغ عشق' میں کئی شعر دیر تک اپنے سحر سے نکلنے نہیں دیتے، اب دیکھئے نا، اگر چہ شاہ غزالی بخوبی جانتا ہے کہ زہر پینے والوں کو زہر اپنا ذائقہ بتانے کا موقع نہیں دیا کرتا مگر وہ بڑے تیقّن سے کہتا ہے۔

پھر بتاؤں گا میں اس کا ذائقہ
پہلے مجھ کو زہر کھانے دو ذرا

کہتے ہیں کہ نئے تخلیق کار میں پرانے تخلیق کار کو بولنا چاہئے، گویا روایت کے تسلسل کو نئی حسیات میں ڈھالنے کی ہنر کاری ہی شعر کو جلا بخشتی ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے۔ ''عشق اول در دل مع پیدا می شود'' تو اس تناظر میں مجھے شاہ غزالی کا کمال سہولت سے کہا ہوا یہ شعر سرشار کر دیتا ہے۔

پہلے تو اس نے مجھ میں جلایا چراغِ عشق
پھر ایک روز خود اسے بے نور کر دیا

(2023 کے ستمبر کی 15 ویں صبح)

چراغ عشق
شاہ غزالی

میں ہوں پنڈال تیری چاہت کا

وبا کے موسم کی تنہائی نے قلم قبیلہ کو آن لائن اکٹھے ہونے کا شعور بخشا اور جب آن لائن عالمی مشاعروں کا ڈول ڈالا گیا تو دیکھتے ہی دیکھتے ادبی دنیا بھی سچ مچ کے عالمی گاؤں میں بدل گئی کیونکہ اب زمینی مشاعروں کے برعکس ان شعری نشستوں میں کم و بیش پوری اردو دنیا کے سخنور یک جا ہو گئے تھے، پشاور سے نیویارک تک اور کراچی سے کیلگری تک کے شعرا سے برقی ملاقاتیں شروع ہو گئیں ایسے ہی ایک مشاعرہ میں کینیڈا کیلگری سے شریک عبدالباسط طاہر کچھ اس طرح دل کو بھا گئے کہ جیسے جنم جنمانتر کی دوستی ہو، میرے کوشش رہتی ہے کہ مشاعرہ کے ماحول میں سنجیدگی اور متانت کے ساتھ ساتھ قدرے شگفتگی بھی قائم رہے جسے کم کم احباب سراہتے ہیں مگر عبدالباسط طاہر ان دوستوں میں شامل ہیں جنہیں بے تکلفی کے لئے کسی بہانے یا جواز کی کبھی ضرورت نہیں پڑتی، سو ان سے دل و جاں کے کئی رشتے استوار ہوئے، شعر اور نثر دونوں میدانوں میں وہ خوب رواں ہیں، اب کے وہ اپنی تازہ تصنیف ’’رنگ حیات‘‘ کو اشاعت پزیر کرنے والے ہیں، یہ ایک شعری مجموعہ ہے بلکہ ایک طرح سے گم شدہ بیاض ہے جو اچانک ہی بازیاب ہو گئی یہ قصہ انہوں نے اس شعری مجموعہ کے دیباچہ میں تفصیل سے لکھا ہے، میرے پاؤں میں چکر ہے اور مسلسل سفر میں رہنے

کی وجہ سے بہت دنوں تک رنگِ حیات سے دوستی نہ کر سکا لیکن اب جو اسے پڑھنا شروع کیا تو بہت اچھا لگا، عبدالباسط طاہر نے اپنی طبیعت کی شگفتگی اپنے شعروں میں بھر دی ہے بہت ہی سادہ لفظوں میں دل کی کیفیات کا بیاں کرنا ایک بہت مشکل آرٹ ہے، اسی لئے سیانے کہتے ہیں کہ مختصر لکھنے کے لئے بہت وقت درکار ہوتا ہے اسی طرح آسان لکھنا بھی بہت اٹکل مانگتا ہے، عبدالباسط طاہر نے بہت سادہ اور بہت کم لفظوں میں اپنے گردوپیش کی زندگی کے حالات، واقعات اور نشیب وفراز کو کمال نظم کیا ہے، اس لحاظ یہ شعری مجموعہ سہل ممتنع کی عمدہ مثال ہے کیونکہ ان سیدھے سادے اشعار میں آپ کو بڑے مضامین ملتے ہیں جو آپ کو ایک لمحہ کے لئے چپ کرا دیتے ہیں اور پھر آپ بے ساختہ ان کو داد دینے لگتے ہیں، ''وہ ہے کافر جو مجھ سے برتر ہے'' کتنی سہولت سے انسانی نفسیات کو برتا گیا ہے، خوبصورت اور دلنشین اشعار بار بار آپ کو روک روک لیتے ہیں اور آپ آنکھیں بند کر کے ان کے مفہوم کے ساتھ بہنے لگتے ہیں اور ان کا ہر مصرع اپنے اندر ایک جہان معنی چھپائے ہوئے ہے، انہیں شعر کہنے کا ہنر ودیعت ہوا ہے اس لئے آپ ان کی شعری اور قلبی واردات کے گواہ بن جاتے ہیں بلکہ بسا اوقات ان کا شعر آپ کو اپنی ذہنی اور قلبی واردات کی تشریح لگتا ہے۔ اور مصرعے تو کمال کے ہیں ''صحرا، سراب، دھوپ، نظر سب ہیں دائرے'' اس مصرع کے سحر سے نکلنا آسان نہیں ہے، اسی طرح یہ اظہار یہ دیکھئے کہ کتنی آسانی سے کتنی مشکل اور ادق بات ایک مختصر مصرع میں سمو دی ہے' ہوش رہتا تو مر گئے ہوتے'' میں ان کی غزلیں پڑھتے ہوئے سوچتا رہا کہ خالق کائنات نے ان کو کیسا ہنر ودیعت کیا ہے کہ وہ ایسے بھرپور شعر تخلیق کرتے جاتے ہیں میں تو ان کے اس فن کا اسیر ہو گیا، یہ مصرع دیکھیں کتنی عمدگی

سے آپ کو اپنا طرفدار بنا تا ہے، ''نظر تو آتا ہے پر دیکھنا نہیں آتا'' رنگ حیات میں مضامین کی رنگا رنگی اور لفظیات کا چناؤ ان کے شعر کے اسلوب کو دلکش بنا دیتا ہے، آپ رنگ حیات کی سیر کیجئے اور میں ایک بار پھر اس شعر سے لطف لیتا ہوں۔

میں ہوں پنڈال تیری چاہت کا
مجھ میں لگتی تمہاری محفل ہے

رشک حیات
عبدالباسط طاہر

ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

ساٹھ کی دہائی کے ختم ہونے ابھی دوایک سال باقی تھے جب میں پشاور آیا تھا اور یہی وہ زمانہ ہے جب محبی مشتاق شباب نے ''شباب کی باتیں'' کے نام سے کالم نگاری کی فضاؤں میں اپنی پہلی پہلی اڑان بھری تھی کیونکہ وہ ''شہباز'' سے منسلک ہو گئے تھے، چوک یادگار میں افضل نیوز ایجنسی کے سٹال پر کھڑے ہو کر پہلے پہل محض اخبارات کی سرخیاں پڑھنا میرا معمول تھا لیکن جب میں نے دیکھا کہ سٹال پر موجود صاحب کو میرا روز کا آنا ناگوار نہیں گزر رہا تھا تو مجھے ہمت ہوئی اور کوئی ایک اخبار اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیتا اور جب میں مہینہ بھر میں اتنے پیسے جڑ جاتے کہ کوئی رسالہ یا کتاب وہاں سے خرید سکتا تو پھر ان صاحب سے دوستی ہو گئی، اس لئے بلا جھجک میں نے کھڑے کھڑے کالم پڑھنا بھی شروع کر دیے تھے جنگ اور حریت کے کالم میرے پسندیدہ تھے پھر میں نے دیکھا کہ پشاور کے کچھ نئے لکھنے والے مقامی اخبارات میں مزے مزے کے فیچرز لکھنا شروع ہو گئے تھے،ان میں ''میم'' سے شروع ہونے والے تین نام مہدی حسین (شہید)،مسرور حسین اور مشتاق شباب تھے،مسرور حسین کے کراچی جانے اور مہدی حسین کے محکمہ اطلاعات جوائن کرنے کے بعد صرف مشتاق شباب ہی رہ گئے تھے جو ''وفاداری بشرط استواری'' کے کھونٹے سے بندھے قلم اور کالم سے

جڑے رہے ہر چند ستر کی دہائی کے آغاز ہی میں وہ ریڈیو پاکستان پشاور سے بطور پروگرام پروڈیوسر جڑ گئے تھے اور سرکاری ملازم ہونے کے ناتے اگر چہ وہ اپنے نام سے کالم نہیں لکھ سکتے تھے لیکن ''ادھر ڈوبے ادھر نکلے'' کے مصداق مختلف اخباروں میں مختلف قلمی ناموں سے ان کے کالم چھپتے رہے، دوسری طرف اخبارات میں ادبی خبروں میں جہاں فارغ بخاری، رضا ہمدانی اور خاطر غزنوی کے نام پڑھنے کو ملتے وہیں مشتاق شباب کا نام بھی ایک تواتر سے پڑھنے کو ملتا رہا، اور پھر ایک دن حلقہ ارباب ذوق پشاور کے اجلاس کی خبر پڑھی تو جی کڑا کر کے بلکہ ڈرتے ڈرتے بن بلائے مہمان کی طرح نیشنل سنٹر جا پہنچا، وہاں ادب کی کہکشاں جگمگا رہی تھی وہ سارے ادبی زعما جن کو پڑھا تو بہت تھا ملاقات نہیں تھی ان میں محسن احسان، رضا ہمدانی، طٰہٰ خان، تاج سعید، زیتون بانو اور جانے کون کون شامل تھے، اور یہی وہ دن تھا جب اجلاس کے بعد مشتاق شباب سے نیشنل سنٹر کی سیڑھیاں اترتے ہوئے ملاقات ہوئی اور پھر ان کی محبت اور مہربانی سے ہماری دوستی سیڑھیاں چڑھنے لگی اس بیچ ایک اہم پڑاؤ مشتاق شباب اور ان کے ہم خیال دوستوں کی بنائی ہوئی نئی ادبی تنظیم ''ینگ تھنکرز فورم'' کا بھی آیا جس نے نو واردان ادب کو ایک عمدہ پلیٹ فارم مہیا کیا، یوں مشتاق شباب کی انگلی پکڑ کر چلنے والوں میں آج کے کئی بڑے اور معتبر نام شامل ہیں اور مشتاق شباب کی محبت سے میری خوش قسمتی یہ رہی کہ میں پہلے ہی اجلاس سے شریک ہو گیا تھا نو جوانوں کی اس تنظیم کو جلد ہی اتنا اعتبار ملا کہ شوکت واسطی مرحوم کو کئی بار بھرے مشاعروں میں کہنا پڑا کہ پشاور کا کوئی مشاعرہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب ''ینگ تھنکرز فورم'' کے تازہ کار اس میں شامل نہ ہوں۔ اور یہ سارا کریڈٹ مشتاق

شباب ہی کو جاتا ہے، وہ کہانیاں بھی بنتے رہے، بلکہ پوپ کہانی جس کا بعد میں بہت چرچا ہوا اور مائیکرو فکشن جس نے کہیں اب جا کے رواج پایا نصف صدی پیشتر مشتاق شباب یہ سارے تجربے کر چکے ہیں، جلدی جلدی باتیں کرنے والے سیماب صفت مشتاق شباب نے ادب و ثقافت کے سارے رنگوں کی ہولی کھیلی ہوئی ہے پروڈکشن تو ایک رہی وہ ریڈیو کی صداکاری سے ٹی وی کی اداکاری اور سٹیج کی ہدایتکاری تک کے سارے ذائقے بھی چکھ چکے ہیں اور سچی بات یہی ہے کہ یہ سارے ہنگامے ان کے لئے بس آتے جاتے ہوئے موسموں کی طرح تھے لیکن ان کا اصل عشق کالم نگاری ہی ہے، یہی ان کے دکھ سکھ کا ساتھی ہے میں نہیں کہہ سکتا کہ گزشتہ چھے دہائیوں میں انہوں نے کتنے کالم لکھے اور پشاور اور خیبر پختونخوا کی کتنی علمی ادبی سماجی، سیاسی اور ثقافتی تاریخ کو اپنے کالموں میں محفوظ کیا، لیکن میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ جتنے تازہ دم وہ ستر کی دہائی میں تھے اس سے بھی زیادہ چابکدست وہ آج بھی ہیں میں سمجھتا ہوں کہ کسی بھی شعبے میں کسی معیار کو چھونا ایک اہم کامیابی ہوسکتی ہے مگر اس معیار کو آخر تک برقرار رکھنے والے زعما ہی لیجنڈری حیثیت کے حامل قرار پاتے ہیں اور اب ایک ایسے زمانے میں جب کہ کالم محض ایک خشک اور پھیکے تجزیاتی مضمون کو کہا جانے لگا ہے اور اس مضمون میں زبان کے ساتھ کھلواڑ بھی ایک معمول کی سرگرمی بن چکی ہے تو انگلیوں پر گنے جانے والے چند ایک کالم نگاروں میں ایک نمایاں نام مشتاق شباب کا ہے جو کسی بھی علمی ادبی سماجی یا سیاسی موضوع کو چھوئیں زبان و بیان، کالم کی شگفتگی اور تاثیر میں کبھی کمی نہیں آتی اور پھر جس طرح وہ اپنے کالم میں خوبصورت اور دل کو چھونے والے اشعار کا برمحل استعمال کرتے ہیں وہ بھی انہی کا خاصہ ہے، یہ نام کی رعایت تھی یا

ان کے بھرپور شباب کا تقاضا جو انہوں نے آغاز ہی سے کالم کا عنوان ''شباب کی باتیں'' رکھا مگر پورا سچ یہی ہے گزرے ہوئے مہ وسال کی گرد سے ماوراان کے کالم پر اب تک اسی شباب ہی کی تازہ کاری کی چھاپ نمایاں ہے، انہوں نے شیخ براہیمؔ ذوق کی اس سوچ کے برعکس کہ وقت کے ساتھ ساتھ شباب کے قصے خواب کہانی بن جاتے ہیں نہ تو مشتاق شبابؔ کے اشہبِ قلم کی دلکی چال میں کوئی فرق آیا ہے نہ ان کالم میں کبھی تھکن کے آثار دکھائی دیے ہیں، مانو ان کا کالم پڑھ کر غالبؔ کی طرح قاری کی ''طبیعت، زیست کا مزا'' پانے لگتی ہے اور ابراہیم ذوق کی طرف قطعاً دھیان نہیں جاتا جس نے کہا ہے۔

وقتِ پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

2024 جولائی کی 14 ویں صبح

شباب کی باتیں
مشتاق شباب

محبت کے موسموں کی کھٹی میٹھی کہانیاں

اپنی مضبوط فصیل کے اندر سانس لیتا ہوا کل کا پشاور جتنا مہربان اور مہمان نواز تھا اتنا ہی طرح دار اور پراسرار بھی تھا، اس کی پیچ در پیچ گلیوں میں جنم لینے والی دلچسپ کہانیاں قدیم داستانوں سے زیادہ حیران کن تھیں جو سننے والوں کو مبہوت کر دیتی تھیں، مجھے لگتا ہے کہ خیبر کے پہاڑوں سے اترنے والے تجارتی قافلے جو پشاور کو صدیوں تک اپنے رین بسیرے کے لئے پڑاؤ بنائے رہے اس کی ایک وجہ یقیناً یہ بھی رہی ہوگی کہ یہاں کے قصّہ گو سر شام مسحور کن قصے کہانیاں سنا کر دور دیس سے آئے ہوئے ان مسافروں کی تھکن لمحوں میں کافور کر دیتے تھے اُس وقت پشاور کی ہر سرائے داستان سرائے بنی ہوئی تھی، کہانی بننا ایک مشکل مشق سہی مگر کہانی سنانا بھی ایک خاص اٹکل کا متقاضی ہوتا ہے اور پشاور کے قصّہ گو اپنے فن میں طاق تھے اور ایک طرف ان کے اس فن کی گواہی ان سیاحوں کی سفر کہانیوں کی کتابوں میں محفوظ ہے تو دوسری طرف پشاور کے دل میں واقع آج بھی پورے قد سے کھڑا قصہ خوانی بازار بھی ان سنہرے دنوں کی یاد دلاتا رہتا ہے اس بازار کی تمام تر رونقیں اپنی جگہ مگر کسی شب دیر سے کسی بند دکان کے فٹ بورڈ پر چپ چاپ بیٹھ جائیں تو اب بھی آنکھوں کے آگے کل کے منظر رقص کناں ہو جائیں گے اور کانوں میں قصہ گویان پشاور کی کہانیاں رس گھولنے لگیں گے اور اگر یہ سب میسر

نہ آئے تو میری طرح آپ بھی قصہ خوانی کے عقب میں جنم لینے اور قصہ خوانی میں بچپن، لڑکپن اور اوائل جوانی کی سرشاری کے زمانے بتانے والے مشتاق احمد مشتاق کی کہانیاں پڑھنا شروع کریں ان کی بیشتر کہانیاں اسی پراسرار شہر پشاور کی گلیوں میں جنمی اور پروان چڑھی ہوئی ہیں، میں ایک نشست میں ان کی دو کہانیاں نہیں پڑھ سکا ہر کہانی مجھے اپنی بانہوں میں بھر کے ان دنوں کی بھول بھلیوں میں لے جا کر چھوڑ دیتی ہے جہاں اس کہانی کی کرادار محبتوں میں شرابور ایک دوسرے میں کھوئے ایک دوجے کے سہارے زندگی بتا رہے ہوتے ہیں اور میں آنسوں سے تر بتر چہرے کے ساتھ اپنے اعصاب سہلاتا ہوا کتاب ہاتھ سے رکھ دیتا ہوں، اگلی کہانی کی طرف جانے کی مجھ میں ہمت ہی نہیں ہوتی۔ محبت کے جتنے کھٹے میٹھے مستانے زمانے مشتاق احمد نے اپنی کہانیوں میں بھر دیئے ہیں میں نے بہت کم بہت کم ایسی کہانیاں پڑھی یا سنی ہیں، مجھے ایک بات ہمیشہ حیران کرتی ہے کہ مشتاق احمد کو پشاور کو چھوڑے ہوئے پانچ چھے دہائیاں ہو چکی ہیں اور اس دوران بمشکل وہ دو یا تین مرتبہ ایک دو دن کے لئے اور ایک دو دہائیوں کے وقفے سے آئے ہیں پھر یورپ اور امریکہ میں ایک کامیاب چیف انجینئر کے طور پر شب و روز مصروف رہنے والے اس کہانی کار کے اندر اس کا پشاور ابھی تک تمام تر جزئیات کے ساتھ اسی طرح زندہ اور جوان ہے جیسے انہیں پشاور چھوڑے شاید ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا، مجھے ان کی جنم بھومی سے جذباتی وابستگی پر اور فوٹو گرافک میموری پر رشک آتا ہے گلیاں کوچے اور بازار ہی نہیں کبھی ان میں زندگی کرنے والے کردار بھی آپ کو ان کی کہانیوں کی راہداریوں میں چلتے پھرتے نظر آئیں گے۔ ان کہانیوں کے ساتھ ساتھ مشتاق احمد مشتاق احمد نے اپنے وہ شگفتہ

مضامین، مزاحیہ تحریریں اور انشائیے بھی اس کتاب کے دوسرے حصے میں یک جا کر دیئے ہیں جو صحرائے اریزونا کے شہر فینکس کی ادبی نشستوں میں انہوں نے پڑھ کر ان محافل کو زعفران زار بنایا تھا اور جس کی بنا پر تاشی ظہیر اور دیگر معتبر و مستند شعرا و ادبا نے انہیں امریکہ کا مشتاق احمد یوسفی بھی کہا، میں سمجھتا ہوں کہ یہ کمال بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے کہ ایک تخلیق کار جب چاہے اپنی کہانیوں سے آپ کی آنکھوں میں دھواں بھر دے اور جب چاہے اپنے شگفتہ مضامین سے آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹوں کے پھولوں کا باغ کھلا دے، مشتاق احمد مشتاق کے کمال ہنر کا یہ ذائقہ آپ کو سرشار کر دے گا۔۔۔

2024 کے ماہ آزادی کی دسویں صبح

ریت پر لکھی کہانی

مشتاق احمد مشتاقؔ

دیکھو یہ میرے خواب تھے دیکھو یہ میرے زخم ہیں

گزشتہ ربع صدی سے آگ اور خون کی جو ہولناک ہولی اس خطے میں کھیلی جا رہی ہے کون جانے کہ اس خطے کے باسی آنے والے کتنے مہ و سال تک ان مہم جویوں کی ہوس اور نفرت بھری شوخیوں کی بوئی ہوئی فصل کاٹتے رہیں گے اور آنے والی کتنی نسلوں کو ہماری نسل یہ یقین دلانے کی کوشش کرتی رہے گی کہ ہم اُس سفّاک اور تاریک دور سے بہت آگے آ گئے ہیں جس دور میں بادشاہ انسانوں کو بھوکے شیروں کے آگے ڈال کر ان کی بے بسی پر قہقہے لگایا کرتے تھے یا پھر کوئی بادشاہ ملاحوں کو حکم دیا کرتا تھا کہ انسانوں بھری کشتی کو منجدھار میں لے جا کر الٹا دو کیونکہ ملکہ عالیہ کو ڈوبتے ہوئے انسانوں کی چیخ پکار سے لطف لینا ہے، جنگلوں میں چیخنے والی قدیم حیوانیت کو ہم جدید دور کے انسانی حقوق کے دعویٰ دار ملک کے ایک سربراہ کی اس 'شوخی' سے کس طرح الگ کر پائیں گے جس نے نائن الیون کے شکار ٹاورز کے ملبے پر کھڑے ہو کر دکھائی تھی شاید اس لئے بھی کیونکہ اسی ملبے سے اس نے ایک رائیگاں سفر کا آغاز کرنا تھا جس کی منزل بیس برس تک مسلسل انسانیت سوز مظالم ڈھانے کے بعد بھی وہ حاصل نہیں کر سکا اور بے نیل مرام لوٹ گیا اگرچہ اس کے ساتھ اس مہم جوئی میں اس کے ہم خیال ممالک بھی شریک تھے اور کھربوں ڈالرز جھونکنے اور کئی ہزار فوجیوں کی ہلاکت

ان گنت فوجیوں کو معذور اور زخمی بنانے کے باوجود اپنا ہدف حاصل نہ کر سکا دوسری طرف اپنی مشقِ ستم سے کئی معصوم نہتے شہریوں کو شہید کرنے کے باوجود نہ تو کوئی ادارہ مستحکم ہو پایا نہ ہی معاشی طور پر افغانستان میں کوئی قابلِ ذکر ترقی نظر آئی اور نہ ہی بے تحاشا ڈالرز لگا کر، ان کی تربیت یافتہ افغان فورس، کوئی بری بھلی کارکردگی دکھا سکی سوائے اس کے کہ افغان فورس کے آئے دن طالبان کے جان لیوا حملوں کا شکار ہوتے رہے اور بالآخر سابقہ مہم جویوں کی طرح یہ بھی چھوٹی سی آبادی اور کم وسائل والے افغانستان میں قدم جمانے کی حسرت لے کر اب اپنے اعصاب سہلا رہے ہیں، بظاہر یہ کہانی بس اتنی ہی ہے لیکن رکئیے بیس برسوں پر محیط یہ کہانی اتنی بھی سادہ نہیں ہے، اس کہانی کے حوالے سے دنیا بھر کے بہت سے جنگی وقائع نگار اور اس خطے پر نظر رکھنے والے کئی ایک تجزیہ کار اپنے اپنے طور پر ایک تواتر سے نتائج اخذ کرتے رہے ہیں، مجھے ان میں اور عتیق احمد صدیقی کے تجزیوں، تبصروں اور نتائج اخذ کرنے وہی فرق لگتا ہے جو فرق انتظار حسین کے نزدیک احمد ندیم قاسمی اور قراۃ العین حیدر کے افسانے میں ہے وہ لکھتے ہیں کہ

> ''جب میں احمد ندیم قاسمی کا افسانہ پڑھتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے ان کے محلے کے کسی گھر میں آگ لگی ہوئی ہے اور محلے میں سب سے زیادہ پریشان اور مضطرب شخص احمد ندیم قاسمی ہے، اس کے بر عکس جب میں قراۃ العین حیدر کا افسانہ پڑھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے آگ اس کے اپنے ہی گھر میں لگی ہوئی ہے''

دراصل عتیق احمد صدیقی اپنے گرد و پیش کے سیاسی، سماجی۔ بلکہ ادبی اور ثقافتی نشیب و

فراز پر بھی نہ صرف گہری نظر رکھتے ہیں بلکہ ان کے حوالے سے اپنا ایک منفرد نقطہ نظر رکھتے ہیں اور کمال چابکدستی سے اپنی تحریر میں اس کا بلاکم وکاست اظہار کرتے ہیں موضوع بھلے سے کتنا بھی خشک اور گھمبیر ہو نہ ان کے تجزیے کبھی بوجھل ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کی روانی میں کوئی کھنڈت پڑتی ہے اسی لئے امریکہ ان کے اتحادیوں کے جنگی جنون اور انسان دشمنی کی داستان کو تاریخ کے اوراق بنانے والے عتیق صدیقی کے کالموں میں وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ ان کی انسان دوستی بھی سانس لیتی نظر آتی ہے، دوسرے تجزیہ کاروں سے ان کے کالم، حقائق کے حوالے سے الگ ہونے کی ایک اور وجہ بھی ہے کہ عتیق صدیقی پشاور کے باسی ہیں جس کے ہمسائے میں گھنٹہ بھر کی ڈرائیو پر افغانستان کی سرحد ہے جہاں کے رہنے والوں کی پشاور آمد و رفت ہمیشہ سے معمول کی سرگرمی رہی ہے یہی وجہ ہے کہ ملک کے دوسرے شہروں کی نسبت پشاور کے لوگ ان کو غیر ملکی کی بجائے ہمسایہ سمجھتے ہیں اور پشاوری روزمرہ کے مطابق ''ہمسایہ ماں پیو جایا'' (ہمسایہ سگے بھائی کی طرح ہوتا ہے) اور پورا سچ یہ بھی ہے کہ جنگی جنونیوں کی لگائی ہوئی اس آگ نے دونوں گھروں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا گویا یہ آگ قراۃ العین حیدر کی طرح عتیق صدیقی کے اپنے گھر میں لگی ہوئی تھی اس پر مستزاد یہ کہ وہ گزشتہ کئی دہائیوں سے امریکہ میں رہ رہے ہیں اور وہاں کے سیاسی اتار چڑھاؤ پر بھی ان کی اتنی گہری نظر ہے کہ وہاں کے لکھنے والے کسی قسم کی بھی سیاسی ایکٹی ویٹی ہونے پر فوراً ٹیلی فون کر کے ان کی رائے لینا ضروری سمجھتے ہیں، یہ مجموعہ بیس سالہ جنگ کے حوالے سے لکھے گئے کالموں کا 'پہلا حصہ' ہے یہ تجزیے اور پیشگوئیاں کس طرح درست ثابت ہوئیں اس کے لئے دوسرے حصے کا انتظار کرنا پڑے گا، جن کے

بارے میں عتیق صدیقی، احمد فراز کی زبان میں فقط اتنا ہی کہتے ہیں۔۔۔۔

دیکھو یہ میرے خواب تھے دیکھو یہ میرے زخم ہیں
میں نے تو سب حسابِ جاں بر سرِ عام رکھ دیا

تقویم
عتیق احمد صدیقی

محبتیں

جس دن ساکنانِ شہرِ قائد کے مشاعرہ میں شرکت کے لئے مجھے کراچی جانا تھا اس دن صبح حسبِ معمول افراز علی سیّد سے ٹیلیفون پر امریکا بات ہو رہی تھی تو ہمیشہ کی طرح ان کے پاس میری عزیز از جان پوتیاں سیدہ عمارہ افراز اور سیّدہ اریبہ افراز بھی بیٹھی سن رہی تھیں، کراچی کا سن کر سیّدہ عمارہ نے فوراً کہا، ''دادا! کراچی میں کوئی مشاعرہ ہے کیا؟'' میں کیا بتاؤں عمارہ جانو کا یہ معصومانہ استفسار مجھے کتنا سرشار کر گیا، سچ کہوں تو سیّد ذیشانؔ ناصر، افراز علی سیّد اور ابتسام علی سیّد کے بچوں کی یہ چھوٹی چھوٹی باتیں میرے اندر بے پناہ توانائی بھر دیتی ہیں۔

☆ میں، سیّد ابتہاج ذیشان ، سیّد وہاج ذیشان ، سیّدہ عمارہ افراز (Syeda Ammara Afraz)، اشمان علی سیّد (Syed Ashmaan Ali)، سیّدہ اریبہ افراز (Syed Areeba Afraz) اور سیّدہ ایشال زینب کا کئی حوالوں سے بہت مقروض ہوں کہ فاصلوں اور ادبی اسفار کی وجہ سے میں اُن کو اُن کے حصّے کا پورا وقت نہیں دے پا رہا۔

☆ میں ان تمام احباب کی محبتوں کا بھی مقروض ہوں جنھوں نے مجھ ہیچمدان کی کم مائیگی کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی کتاب میں بطور دیباچہ شامل کرنے کے لئے میرے تاثرات اور آرا بھجوانے کا مجھے حکم دیا، میں نے ان تمام دیباچوں میں سے

کچھ منتخب تبصروں، تجزیوں اور تنقیدی آرا کو ’’خیال خاطرِ احباب‘‘ کے نام سے یکجا کر دیا ہے بشرطِ صحت و زندگی جلد ہی اس کی دوسری جلد پر بھی کام شروع کروں گا، ان شا اللہ۔

☆ میں ماہنامہ بیاض لاہور اور سہ ماہی ارتکاز کے مدیر، شاعر نقاد اور میرے دل کے بہت قریب دوست نوید صادق کی بے پناہ محبت کا بھی مقروض ہوں کہ انھوں نے دیباچوں کی اس کتاب کا بہت عمدہ دیباچہ لکھا۔

☆ ستیہ پال آنند جی کا تو میں مقروض بھی ہوں اور ان سے شرمندہ بھی کہ اس کتاب کے لئے ان کا لکھا ہوا ایک شاندار مضمون جس میں ’دیباچہ‘ کے حوالے سے ایک عمدہ تجزیہ بھی کیا گیا تھا، میرے لیپ ٹاپ سے جانے انجانے میں اڑ گیا، اور ستیہ جی بھی اسے اپنے ای میل اکاؤنٹ سے بازیاب نہ کر پائے کیونکہ ان کا تکنیکی معاون ہندیاترا پر تھا۔

☆ میں بہت ہی محبتی دوست سید ابرار حسین کی محبت کا بھی مقروض ہوں جو کہ مختلف ممالک میں پاکستان کے سفیر رہنے کے عرصہ میں بھی کارِ ادب کے لئے ہمیشہ دستیاب رہے انہوں نے بہت محبت سے اس کتاب کے فلیپ کے لئے اپنی رائے سے نوازا۔

☆ محبی مشتاق شباب کی محبتوں کا تو خیر کیا مذکور کہ وہ تو میرے ادبی سفر کے آغاز ہی سے مجھے ہمہ وقت میسر ہیں، انھوں نے بھی کمال مہربانی سے اپنے تاثرات سے میری کتاب کو اعتبار دیا۔

☆ میں کتاب کے کمپوزر سید اکرام علی شاہ (شاہ جی) کی سعادت مندی کا بھی مقروض

ہوں کہ کمپوزنگ کے بعد مسودہ حوالے کرنے کے بعد انھوں نے کسی بھی قسم کا معاوضہ لینے سے صاف انکار کر دیا۔

☆ میں پروفیسر حسام حر کی محبتوں کا بھی مقروض ہوں کہ انہوں نے خیالِ خاطرِ احباب کو ترتیب دینے اور ٹائپو ز ختم کرنے میں حسب معمول اپنی بہت سا قیمتی وقت دیا

☆ میں ایشیا پرنٹرز اینڈ پیکج کے ادب دوست مدارالمہام محمد عمر قریشی کی بے کراں محبتوں کا بھی مقروض ہوں کہ اس مہنگائی کے دور میں انھوں نے بھی اس کتاب اشاعت کے تمام تر اخراجات سے مجھے بری الذمہ قرار دیتے ہوئے محض کاغذ مہیا کرنے کا کہا۔

اب میں کیا کہوں۔۔بجز اس کے کہ۔۔۔۔۔۔

اور فرازؔ چاہئیں کتنی محبتیں تجھے

ناصر علی سیّد

0300 582 1433